

ابن انشا



بائیں

نہزات

پا دیے

بہار

لے جمپ

ابن انشاء

• یادیں

• باتیں

• یہاں

• نغزات

اعجاز

شیخ غلام علی آئند سائنس (پرائیویٹ) لمیٹڈ، پبلشرز،

لاہور ○ حیدرآباد ○ کراچی

جس حقوق کو ہم بدعشر مفلوظ

اشان

مطابع : شیخ نسیب زاحم

مطبع : غلام علی پرنٹرز

جاسمہ اشرفیہ، اچھرہ، لاہور

شکیلہ ناھید کے نام

یہ کتاب زمانے کے سیٹھ پرست میں عہد کا پردہ اٹھاتی ہے اس کے شب و روز ہماری دوستی اور غلوں کے سدا بہار پتھروں سے منک رہے ہیں۔ جن دنوں کی یہ داستان ہے سچیت میں وہ ہمارے لازوال غلوں اور محبت کا دور تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس سیٹھ کے کردار اپنا اپنا رول ادا کر کے جنگ کرخصت ہو رہے ہیں لیکن ہماری دوستی اور رفاقت کے شریں گلاب آج بھی پتلے دن کی طرح شگفتہ و تروتازہ ہیں۔

۱۷ جیبہ

۱۷ جیبہ - زوری

۱۹۶۹

مقام اشاعت :

شیخ غلام علی اینڈ سنز پرنٹرز، لمیٹڈ پبلشرز

اولی مارکیٹ، چوک اداہلی، لاہور

بات اتنی پرانی بھی نہیں ہے۔

یہی سن ۱۷۴۷ء کی ایک دوپہر تھی کہ ہم لوگ امرتسر سے ہجرت کر کے لاہور آ گئے۔ شاہ عالمی دروازے کی دیکھ میں سے ابھی دھواں اٹھ رہا تھا۔ مسجد شہید گنج میں چھپے ہوئے سکھ ابھی تک دیوے کے شیش کے باہر مہاجرین کو پھر پھر نازک کر رہے تھے۔ لاہور شہر کی فضا جلے ہوئے مکانوں کی بڑے بوجھل تھی۔ والٹن کے مہاجرین کو پھر میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ مشرقی پنجاب سے مسلمان پناہ گیروں کی ریل گاڑیاں دھڑا دھڑا لاہور پہنچ رہی تھیں۔ ادھر سے ہندو سکھ شہزاد تھیوں کے قافلے مشرقی پنجاب کی طرف جا رہے تھے۔ زندگی کے ہر شعبے میں ایک انتشار ایک اداسی طاری تھی۔ امرتسر، جالندھر، لدھیانہ اور مشرقی پنجاب کے دوسرے دیہات سے جو مسلمان بھی لاہور پہنچا، انہیں غم غمورہ تھا۔

ہم امرتسر کے ادیب شاعر دوست پیلے گوالمندری کے ایک ہوسٹل میں مقیم کرتے تھے۔ پھر وہاں سے مال روڈ پر پاکستانی فوجوں میں آکر ڈیرا جمالیہ پاکستانی فوجوں کا نام پیلے، انڈیائی فوجوں ہو کر رہا تھا۔ اس فی فوجوں کی بدوش روشن چمکیلی فضا میں ہم نے باہر سے آئے ہوئے دوستوں کو پہلی بار دیکھا۔ کسی نے کہا۔

میرا نام اشفاق احمد ہے۔

کسی نے کہا۔

”مجھے ناصر کاظمی کہتے ہیں۔“

”میں اسے حمید ہوں۔ تم سب سے مل کر بڑی خوشی ہوئی؟“

اور پھر ایک روز میں نے ابن انشاء کو دیکھا۔

دلا سا نالا، لہریا لے چمکیلے بال اور ناک پر مونے شیٹوں کی چینک —
پہلی بار دیکھنے پر مجھے وہ کسی ہندو سا ہوکار کا شیم جی لگا۔ میرا حمید اختر نے تعارف
کر دیا۔

”ہمارا بار فار اور ترقی پسند ادیب ابن انشاء۔“

میں نے انشاء سے ہاتھ ملایا۔ وہ شرماسا گیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک بڑی
ذہین اور شہر پرچک سی آگئی۔ اب وہ مجھے ایک بے حد شرارتی اور ٹٹ کھٹ ٹٹکا
لگا اور مجھے اس سے مل کر خوشی ہوئی۔ حمید اختر بولا۔

”اے حمید! تمہیں ابن انشاء سے مل کر بہت خوشی ہوگی، کیونکہ
تمہاری طرح یہ بھی کبھی کسی چڑیوں، غوطوں کی باتیں بڑے
مڑے لے کر کرتا ہے۔“

ابراہیم جلیس نے قہقہہ لگا کر کہا۔

”ارے بچے یہ اندازے شیر خرد قیصر ہے۔“

حمید اختر بولا۔

”اور محرقی بھی۔“

ابراہیم جلیس نے ایک فلک شکن قہقہہ لگایا۔ ابن انشاء نے بڑے
مہو لہجے سے سر ہلاتے اور چینک کے شیشے صاف کرتے ہوئے کہا۔

”دوستو! میں ابن انشاء ہوں لیکن چائے کا آرڈر کون دے رہا ہے؟“

احمد راہی کہنے لگا۔

یہ جلیس بڑے اونچے اونچے قہقہے لگاتا ہے اسے پکڑنا چاہیے۔

حمید اختر نے جلیس کی گردن پکڑ کر کہا۔

”لنگو آؤ کیسے چاہتے۔“

ابراہیم جلیس نے گردن جھکا کر ہنستے ہوئے کہا۔

”چائے کا آرڈر میں دیتا ہوں مگر پیٹری ابن انشاء لنگو آؤ گے گا۔“

ابن انشاء شیشے صاف کر کے چینک ناک پر جارہا تھا۔ اس کے منہ
ہونٹ کے کونے میں شرارت بھری مسکراہٹ کی لکیر ابھری۔ کہنے لگا۔

”دوستو! میرا یہ تجربہ ہے کہ میں نے جب بھی فی باؤس میں پیٹری
لنگو آؤ ہامی آئی۔ ہاں ساتھ والی میز پر ناظر کاظمی بیٹھا ہے۔“

اس کا ادھار بھی چلتا ہے اور میرے اسے تازہ پیٹری لاکر دیتے ہیں!

ناصر کاظمی نے آخری سگریٹ کا آخری کش لگایا اور ساتھ والی میز سے
اٹھ کر ہماری میز پر آگیا۔ ابن انشاء کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

”میرا سے مل کر چائے کے ساتھ انشاس کھا یا کرتا ہوں لیکن تمہاری
خاطر سارے لاہور شہر کی پیٹری لنگو آؤ گے ہوں۔“

پھر اس نے فی باؤس کے میرے لال کو ملا کر کہا۔

”لال! میرے دوستوں کو عمدہ پیٹریاں لاکر کھلاؤ۔“

یہ میں نے محسوس کیا کہ ابن انشاء فضول خرچ بالکل نہیں تھا بلکہ وہ ہر خرچ
کو فضول سمجھتا تھا۔ بڑا کم خرچ تھا لیکن بالائیں تھا۔ اس کے دوست اس کو بہت

چاہتے تھے۔ جلد ہی ہمارا ایک ترقی پسند گروپ بن گیا۔ حمید اختر، ابراہیم جلیس

کرمانی، بسطن، احمد راہی، عارف عبدالمین، اجروہ مسرور، خدیجہ مستور، احمد ندیم قاسمی

عبد اللہ ملک اندوہ دوسرے اصحاب نے مل کر انہیں ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی۔ ہر

بھٹے اس کے ادبی اجلاس ہونے لگے۔ انشاء نے مضامین اور غزلیں نظمیں پڑھی جاتیں

نقد و روشنی ہوتیں۔ ابن انشاء ان بحثوں میں عجم پور جھٹھکتا۔

ان ہی دنوں ابن انشاء نے اپنی مشہور طویل نظم ”انداز کی رات“ لکھی اور

انجن کے اجلاس میں پڑھی۔ اس پر بحث شروع ہو گئی۔ ابن انشاء انجن کے اصول و ضوابط کے مطابق اس بحث میں حصہ نہیں لے سکتا تھا۔ چنانچہ وہ میرے ساتھ کرسی پر بیٹھا پہلو بدلتا رہا۔ اسلوب کے اعتبار سے یہ نظم اُس مہدی ترقی پسند نظموں سے بہت مختلف تھی۔ بیان بڑا سادہ تھا۔ انہماک کچھ اس طرح کے خیالات کا تھا کہ جو اس زمانے کی ترقی پسند تحریک سے ذرا باہر کھینچے۔ بہر حال بحث جاری رہی۔

کچھ نے کہا یہ چاندی ہے کچھ نے کہا چہرہ تیرا
مجھے ابن انشاء کی یہ نظم بڑی پسند آئی۔ شاید اس لیے کہ میں خود بغداد کی راتوں کا سفر تھا اور اف ایل کی شہزادیوں سے مشتق کیا کرتا تھا۔ میں ابن انشاء سے بہت کچھ سیکھتا تھا اور یہی اُس سے میری دوستی کا آغاز تھا، کیونکہ میں دوستی نہیں کر سکتا، پیار کر سکتا ہوں اور میں ابن انشاء سے پیار کرنے لگا۔ اب مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ بھی مجھ سے پیار کرتا ہے۔

ان دنوں ابن انشاء ایبٹ روڈ پر نشاط سینما کے سامنے والے ایک چھوٹے سے سرخ مکان میں رہتا تھا۔ یہ مکان انہوں نے پھلورے آنے کے بعد لاٹا کر دیا تھا۔ اس مکان کی چھت آگے کی جانب ڈھلانی تھی اور سرخ تھی۔ ابوالہجیم مجلس اس مکان کو چینی پیگور ڈاکا کرتا تھا۔ مکان کے آگے ایک ننھا سا آئین تھا۔ آئین میں پہلے کے ہیرو کی تختی چھاؤں رہتی۔ میں اور انشا برآمدے میں بیٹھے باتیں کیا کرتے۔ وہ آئینہ میز پر رکھے کھڑک کھڑک کر شہو بناتا ہوتا۔ اندر سے چائے کی دو پیالیاں آجاتیں۔

”اے حمید! لاہور کی گلیاں بغداد کی گلیوں سے بڑی مٹی جلتی ہیں۔“
میں نے کہا۔

”تم نے بغداد کی گلیاں کہاں دیکھی ہیں؟“
ابن انشاء نے سر ہلا کر سہراتے ہوئے کہا۔

”ایک نہ ایک دن بغداد کی گلیاں مزور دیکھوں گا۔“
بھر وہ تویسے سے گل رگڑتے ہوئے پوچھتا۔
”تم نے نیا مینی رسا، یونٹائزر، پڑھا؟“
”نہیں تو۔“
”ابھی لاتا ہوں۔“

اندر سے وہ ”یونٹائزر“ کا رسالہ اٹھا لایا اور ہم مل کر اس کی ورق گردانی کرنے لگے۔ چائے پیئے ہوئے وہ مجھ سے باتیں کرنے لگا۔

”اے حمید! تم رومانٹک ہو۔ تمیں بیسی شور بھی ضرور ہونا چاہیے۔ میں چاہتا ہوں تم ”یونٹائزر“ باقاعدگی سے پڑھا کرو۔ پھر جب تم کہانیاں لکھو گے تو وہ تمہاری یادگار کہانیاں ہوں گی۔“
میں نے ”یونٹائزر“ کا رسالہ بند کر کے ابن انشاء کے کان میں کہا۔

”رہا زاد کا ایک اور خط آیا ہے۔“

ابن انشاء کی آنکھوں میں چمک سی آگئی۔

”کہاں ہے کہنے۔ لا مجھے بھی پڑھ کر دے۔“

”میں اپنی مجبورہ کا خط تمہیں کیوں سناؤں؟“

ابن انشاء نے پوچھ کر آئینہ برآمدے کے ستون سے لٹکا دیا اور بالوں میں لکھی کرتے ہوئے بولا۔

”کہنے! مجھ سے اپنی محبت کے بارے میں شورہ نہیں لوگے تو کیا حمید آخر اور سبط حسن سے لوگے؟ پھلو میں تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ تم اپنے تحت بھرے خطوط میں میری نظم ”بغداد کی ایک رات“ کے شعر استعمال کر سکتے ہو۔“
میں نے کہا۔

”میں اپنی مجبورہ سے ہاتھ نہیں دھونا چاہتا۔“

ابن انشاء اپنی شرارت بھری چکیلی آنکھیں جھپک کر بولا۔

”بھڑ کیا ہوا۔ زیادہ سے زیادہ ہی ہو گا کہ وہ ہمیں چھوڑ کر بھٹے خط
کھتے شروع کر دے گی۔ دینے بھی وہ بے چاری مہربانے بے بے
دوانگ افسانے کب تک سنتی رہے گی۔ میں اسے چھوٹی چھوٹی
پیاری پیاری نظیں سنایا کر دیں گا۔ نگرہ کرو۔ کبھی کبھی مہار سے
افسانوں کا ذکر بھی کر لیا کریں گے۔“

میں نے ریمان کا خط نکال کر ابن اشاء کو دیا۔ وہ کھول کر پڑھنے لگا۔
اس کے ابرو کبھی اوپر اٹھتے کبھی نیچے گرتے۔ سینک کے پیچھے چکیلی آنکھیں
لفظوں کا تعاقب کرنے لگیں۔

”اے یہ خط جعلی تو نہیں؟ مجھے تو یہ تہاری کارستانی معلوم ہوتی ہے؟
میں نے مسکریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

”ریمان کے خط بڑے رومانیک ہوتے ہیں۔ ہمیں اس لیے شک ہوا۔ بچے
دیکھو اس کا نام لکھا ہوا ہے۔“

ابن اشاء نے خط کے نیچے ریمان کے دستخط بڑے طور سے دیکھے۔
”ریمان کے دستخط تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ یا تو یہ خط تمہارے خود لکھا ہے
اندیا پھر ریمان کو تم خود لکھ کر دیتے ہو؟“

میں ہنس پڑا۔ ابن اشاء بھی مسکرایا۔ پھر میری طرف گردن جھکا کر کہنے لگا۔
”کیسے کیوں شریف بیبیوں کو خواب کر رہے ہو۔ اچھا میں اس ٹرکی سے
موں گا، کہوں گا۔ بی بی اب امرتسری دسواں تو بیک وقت چاروں کیوں
سے عشق کر رہا ہے نہیں تو ابھی کوئی ریشورٹ میں چل کر مجھے فروٹ
لیک لکھاؤ۔“

میں نے ابن اشاء کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔

”منظور ہے؟“

کوئی ریشورٹ منسلک روڈ پر ریجنٹ سینما کے باہر سامنے ہوا کرتا تھا۔

بعد میں یہاں موٹرول کا شور دم کھل گیا۔ اب وہ بھی نہیں رہا۔ اس ریشورٹ
کی بہار محض دس دن ہی رہی۔ اس ریشورٹ میں کوئی خاص بات بھی نہیں
تھی۔ لیکن کچھ عرصہ تو ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کی منڈلی اس ریشورٹ میں
اپنی محفل جاتی رہی۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ یہ نیا نیا کھلا تھا۔ اس
ریشورٹ میں اتنی ہوتی میری ایک تصویر آج بھی میرے پاس ہے جس کے
نیچے ابن اشاء نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا ”نٹ کٹ اے حمید“

ابن اشاء پورے بہن کو تیار ہوا تو ہم ایٹ روڈ پر آ گئے۔

”ذرا صبرت صاحب کو دیکھتے چلتے ہیں۔ شاید کرمانی بھی آگیا ہو۔“

روزنامہ امروز کا دفتر ان دنوں ایٹ روڈ پر ہوا کرتا تھا اور ابن اشاء
کے مکان کے باہر سامنے تھا۔ ہم امروڑ کے دفتر میں آ گئے۔ چنانچہ صبرت ابھی
تشریف نہیں لاتے تھے۔ ہم نے حق اٹھا کر دیکھا ان کا کمرہ خالی تھا۔ اس دفتر کے
پہلوں کسی ٹرانسپورٹ کمپنی کا دفتر تھا اور باہر ایک آدھ ٹرک اکثر کھڑا رہتا
اور کلینر وغیرہ چھوٹی موٹی مروتوں میں لگے رہا کرتے تھے۔ ٹرانسپورٹ کمپنی کے منیجر
کا دفتر صبرت صاحب کے کمرے کے برابر میں تھا۔ اور اُس کے آگے بھی چھوٹی چوڑی
رہتی تھی۔

ایک روز ایسا ہوا کہ ایک نووارد کلینر کو ڈرائیور نے کہا کہ میجر سے جا کر
نارنگی پرچی لے آئے۔ کلینر کو ابھی دفتر کے انٹیمب و فرزا کا علم نہیں تھا۔ اُس نے
میجر کے دفتر میں جانے کی بجائے صبرت صاحب کے دفتر کی چوڑی اٹھائی اور اندر
آگیا۔ سامنے میز پر ٹیبل پیسٹ چلائے صبرت صاحب کا کلم کھڑے تھے۔ کلینر نے
ایک نیم و شیم بونچوں والے آدمی کو دیکھا تو سمجھ گیا کہ یہی میجر ہے۔ اب صبرت
صاحب کو بھی کسی نووارد کی موجودگی کا احساس ہوا۔ چپے کے پیچھے سے اپنی
بڑی بڑی سر آنکھیں اٹھا کر پوچھا۔

”فرمائیے مولانا! میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

ہم کو الٹی ریسٹورنٹ میں آکر بیٹھ گئے۔

شیشوں کے پیچھے سے میکو ڈورڈ والے پیل کے گھنے درخت نظر آتے تھے۔ کبھی دقت کوئی تانگو گزر جاتا۔ بہت کم لوگ آ جا رہے تھے۔ پیل کے پتے بڑے بڑے بھرے تھے۔ کچھ شاخوں پر سنواری رنگ کی نئی نئی کوئیں بھی چوٹی تھیں۔ شاید بہار کا موسم تھا۔ یعنی چیت و ساکھ کا مہینہ تھا۔ ان دنوں نہ گرمی لگتی تھی نہ سردی۔ ہر موسم پر بہار کے موسم کا گمان ہوتا تھا۔ مجھے یاد ہے یہ ان ہی دنوں کی بات ہے۔ میں کافی ہاؤس میں اکیلا بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا کہ مضبوط قن و تو شوالا باکسرنا صفر میرا اندھا اور میری طرف دیکھ کھینٹے ہوئے ہوا۔

”ارے تو یہاں بیٹھا ہے اور باہر اتنی خوبصورت گولیں رہی ہیں۔“

ہاں۔ اُن دنوں مئی جون کی چھٹی چھٹی ہوتی دو بہریں گرم لوئیں اور پوہ ماگھ کے مہینوں میں چھٹے والی سرد بریلی ہوا تھی۔ یہ سب کچھ بڑا اچھا لگتا تھا۔ موسموں میں ہمارے بدن کی خوشبو تھی۔ گرم لوئیں ہمارے سانس کا ایک جھونکا تھیں۔ دسمبر کی سرد ہوائیں ہمارے جھولے سے جھوکر گرم ہو جاتی تھیں اور بہار کی ہوائیں میں اپنے ساتھ ساتھ اڑاتے لیے چھرتی تھیں۔ پیل کے نزد اور سرخ پتوں کی طرح ہم موسموں کے ساتھ ساتھ جوں جوتے تھے۔ ہر موسم کا طبع ہوتا سوج ہم سے ہاتھ ملاتا تھا۔ آدھی رات کے ساہلے میں لاہور کا سنان سرگرمی پر مگر گشت کرنے دورے پہان لیتے تھے اور ہم ستاروں کو دیکھ کر وقت بتا دیا کرتے تھے۔ گرم لوئیں انہیں ٹھنڈا رکھتی تھیں۔ سرد ہوائیں ہمیں گرم کر دیتی تھیں۔ بہار کی ہوائیں ہمیں امتداد بخشی تھیں اور راتوں کی آواز گردی تھیں دن کو نئے نئے خیال مطلق کرتی تھیں۔

لیکن اب ایسا نہیں ہے۔ موسموں کا ہاتھ ہمارے ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے۔ فزاں بہار اور بہت جھوٹا تیر ہماری کمان سے نکل گیا ہے۔ اب ہم صبح دیکھتے ہیں۔ سوج طلوع ہوتا نہیں دیکھتے۔ رات دیکھتے ہیں۔ ستارے نہیں دیکھتے۔

کلیئر نے پتھری بنجالی بیچے میں کہا۔

”جی کرم داد ڈرا تیر چھٹی اٹھتی نے نیا ٹائر مانگا ہے۔“

حسرت صاحب چومکے۔ ایک ہاتھ سے چہرہ اٹارا اور بولے۔

”کیا فرمایا مولانا؟“

کلیئر نے بالکل ویسے ہی انداز میں پھر کہا۔

”جی جیجی اٹھتی کا ڈرا تیر کرم داد نیا ٹائر مانگتا ہے۔“

چراغ حسن حسرت اٹھ کر کمرے سے باہر آ گئے اور اکاؤنٹ کو آواز دی۔

کر کہا۔

”مولانا البتے بازار سے کچھ ٹائر منگو کر یہاں رکھوا دیجیے۔ لوگ امروز

میں ٹائر مانگتے بھی آ جاتے ہیں۔“

امروز کا یہ دفتر ایک لمبا دل کمرہ تھا جس میں تھے کھڑے کر کے پارٹیشن

کر دی گئی تھی۔ جمید اختر ایک میز پر انڈیا کے اخبار پھیلاتے اس کے تراشے

کاٹ رہا تھا۔ ادنیٰ ہا صحت مند لاہور اور سر پر براؤن رنگ کے بالوں کا

گھٹا چھتہ۔ جمید اختر اب یہ جملہ پڑھنے کا تو اُسے اپنے خوبصورت گھنے بال بہت

یاد آتیں گے کیونکہ اب اس کے سر پر بے بالوں کا سایہ اٹھ چکا ہے۔

دلچسپ لاہور میں خوبصورت عبد اللہ ملک غبروں کا ترجمہ کر رہا تھا اور بار

بار مانتے پڑتے رہتے بالوں کو پیچھے ہٹا رہا تھا۔ ایک جانب عبد الشکور احسن بیٹھے

کچھ لکھ رہے تھے۔ جمید باغی اور کرائی ابھی نہیں آئے تھے۔ ہم کچھ دیر بیٹھے

جمید اختر اور عبد اللہ ملک سے باتیں کرتے رہے۔ جمید اختر نے ہلستے کی چٹیک

منگوائی اور ہم چائے پینے لگے۔ امروز کے دفتر سے باہر نکلے تو میرا خیال تھا کہ اب اس

فرٹ ایکس والی بات بھول گیا ہو گا۔ میں سوچا کہ اس کے دفتر کو جانے کے لیے

گوالمندی کی جانب مڑنے لگا تو اب انشاء نہ کیا۔

کو الٹی ریسٹورنٹ اُدھر نہیں اُدھر ہے۔“

موسم ہمارے ایرکنڈیشنڈ اور سنٹرل بینڈ ڈکروں کے دروازوں پر دھکیں دے کر گزر جاتے ہیں۔ گرمیوں میں ہم اپنی ایرکنڈیشنڈ خواب گاہوں میں مکمل اڑھ کر سوتے ہیں اور سردیوں میں ہم اپنے سنٹرل بینڈ ڈکروں میں بغیر خلاف کے سوتے ہیں۔ ہم نے موسموں کو دھوکا دیا ہے۔ ہم نے موسموں کا مذاق اڑایا ہے، لیکن موسموں کی بھی اپنی عزت نفس ہوتی ہے۔ ہم نے ان کی عزت مخدوش کی۔ انہوں نے ہم سے انتقام لیا۔ ہم نے انہیں چکوتوں میں ڈالا، انہوں نے ہمیں بے راہروں کو دیا۔ موسم تو اپنی جگہ پر کھڑا رہا مگر ہم اپنے مدار سے ہٹ گئے۔

ابن انشاء میرے سامنے بیٹھا تھا۔ ابھی وہ اپنے مدار سے ہٹا نہیں تھا۔ ابھی موسموں کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ ابھی اُسے گرمی لگتی تھی۔ سردی محسوس ہوتی تھی۔ وہ پھولوں کی خوشبو محسوس کرتا تھا۔ اسے طوطوں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں اور ہم دونوں کی زمین لپک ہی سورج کے گرد چکر لگا رہی تھی۔

ہمارا دار ایک ہی تھا۔ چائے آگئی۔ مین جاتے بناتے تھے۔ میں نے ابن انشاء سے کہا ٹوٹ ٹیک کی جگہ کریم رول کیوں نہ منگوا لیں؟ ہنسے لگا۔ نہیں۔ فروٹ ٹیک ہنگامہ ہوتا ہے۔ وہی منگو اور میں ابن انشاء کو چھیڑ رہا تھا۔ مجھے اُس سے پیار تھا۔ اور اس کی دوستی مجھے بڑی عزیز تھی۔ اس کی صحبت میں بیٹھنے کے لیے میں جوتے ڈھونڈتا کرتا تھا۔ ان دنوں وہ بھی اتنا مصروف نہیں ہوا کرتا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، ہم بہت کم ایک دوسرے سے الگ رہتے تھے۔ صبح نو بجے چکر مشروع ہوتا۔ کبھی امر و زکے دفتر میں تو کبھی اسیرا کے دفتر میں اور کبھی ادب لطیف کے دفتر میں۔ یہاں سے فراغت ملتی تو لاہور کی گلیوں میں گشت لگنے نکل کھڑے ہوتے۔ شام کوئی باؤس یا کوئی آؤس میں مغفیل لگتیں۔

بھی دوست وہاں موجود ہوتے۔ کسی کسی پیاری ہوتی۔ بیٹھا کرتی تھیں۔ کسی کوٹے میں الزجلاں شہزاد کے قبضے گونج رہے ہیں، کہیں تعمیر المسین کی لطیف باڑیاں اور فقرے باڑیاں ہورہی ہیں کہیں احمد پھر بلند آوازیں باتیں کر رہا

ہے اور کہیں ناصر کا مٹی اپنی تانہ غزل سن رہا ہے۔ بیڑھیوں کے ساتھ والی میز پر قیوم نظر نے منڈل جما رکھی ہے۔ لیجیے۔ بی۔ آؤس کا دروازہ کھلا اور صفدر میر بھی اپنے پاؤں جھاڑتا، موٹی موٹی آنکھوں سے ماحول کا جائزہ لیتا اندھا کیا، جیسدا اختر اور سبط حسن نے اُسے اشارے سے اپنی طرف بلا لیا ہے۔ اب فضا میں کبھی کبھی صفدر میر کا صحت مند طونانی قہقہہ بھی گونج اُٹھتا ہے۔ اتنی میں م حسن لطیف بھی اپنا لمبا کوٹ سنبھالتے اندھا آگئے ہیں۔ وہ بھی ہمارے ساتھ بیٹھ گئے ہیں۔ لطیف صاحب یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ لدھیانہ کا اصل نام اصل لدھ ہے اور اس کا ذکر بائبل میں ملتا ہے۔

ابن انشاء نے کہا۔

”پھلور کا ذکر تو بیت میں ملتا ہے۔ اس کا اصل نام پھل اور تھا۔ حضرت موسیٰ نے جب اپنے آدمیوں کو وادی سینا کے شمال کی طرف روانہ کیا تو واپس آکر انہوں نے انگور کے گچھے اور سرخ سیبوں کی ٹوکریاں پیش کیں اور کہا کہ یہاں سے دونوں دورات کی مسافت پر ایک بقی ہے جس کے باغ پھلوں سے لدے ہوئے ہیں پس حضرت موسیٰ نے ایک حواری سے اس کا نام پھل اور رکھ دیا جو برگزٹے بچھرتے پھلور بن گیا۔“

”مجبائی یوں تو ہر شہر کا نام کسی نہ کسی کتاب میں مل جائے گا۔“

الزجلاں نے ساتھ والی میز سے آواز لگائی۔

”یاد تو رہا جو ہر کا نہ کا نام تلاش کرنا کہ کون سی کتاب میں ہے؟“

ابن انشاء بولا۔

”یاد تحقیق کا سارا کام مجھے ہی کیوں سونپ دیا۔ کچھ تو ہمت کرو۔“

سب نے پیسے ڈال کر چائے منگوائی اور چائے کی گرمی میں صفاں اور زیادہ

گرم ہو گئی۔ بات میں کو الٹی ریلیٹوٹ کی کر رہا تھا۔

ابن انشاء اس وقت میرے سامنے بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ میں بھی چائے پی رہا تھا۔ ہم فزٹ کیک بھی کھا رہے تھے۔ ابن انشاء نے جیب سے ایک میٹھی گول نکال کر مجھے دی اور ایک اپنے منہ میں ڈال لی۔ میں نے پوچھا۔
 ”یہ کیسی گولی ہے؟“
 کہنے لگا۔

”ہر خوردار پوچھا نہیں کرتے۔ یہ ہینپر منٹ کی گولی ہے۔ تمہارا گلا سہلگل کے موافق ہو جائے گا۔ کھا جاؤ۔“

ابن انشاء مجھے ہوتے جنوں، ریوڑیوں، پکڑیوں، کشتی میٹھی گولیوں اور اس قسم کی نقل کے طور پر کام کرنے والی چیزوں کا بڑا شوقین تھا۔ چلتے چلتے کسی ریڑی والے کے پاس کھڑا ہو جاتا۔

”بار! تھوڑی سی گتہیریاں لے لیں۔ چلتے بھی جائیں گے اور چوستے بھی جائیں گے۔“

پان اُسے کھانا بالکل نہیں آتا تھا۔ پان وغیرہ کلاسے شوق بھی نہیں تھا۔ بس کسی نے زیادہ اصرار کر کے کھلا دیا تو کھالیا۔ ہاں جب ہم ڈھاکے گئے تو وہاں اُس نے دو ایک بار بڑے شوق سے پان کھایا تھا۔ کراچی میں آباد ہونے کے بعد بھی میرا خیال ہے، اُسے پان کھانے کی عادت نہیں پڑی تھی۔ وہ پان اس طرح کھاتا جیسے اُسے کوئی مصیبت پڑ گئی ہے۔ پان اس کے منہ سے باہر آنے کی کوشش کرتا اور وہ اُسے اندر نگھنے کی کوشش کیا کرتا۔ پیک تھوکتے وقت وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر آگے کو جھک جاتا اور بڑی احتیاط سے جھک کر بلکہ ہنچ کر تھوکتا۔ میں اُسے کہا کرتا:

”یاد تم گئے ہیں تو بڑا باندھا کرو۔“

وہ ہنس کر کہتا:

”ہم وضع دار لوگ ہیں۔ پان کھانے میں ہر ممکن احتیاط سے کام لیتے ہیں؛

پھر شریر آنکھیں بھپکا کر کہتا۔

”یاد دے پان ایسی چیز خود کھانے سے بہتر ہے کہ کسی دوسرے کو کھلا کر اُس کا تھانہ دیکھا جائے۔“

ایک دن ہم گوالتڈی کے چوک میں سے گزر رہے تھے۔ ابن انشاء نے ایک جڈ گول گئے والے کو دیکھا تو وہاں رگ گیا۔
 ”گول گئے کھاتے ہیں۔“

ریڑی والے نے ایک ایک پیالی ہمارے ہاتھوں میں تھما دی اور کھٹاس سے بھر بھر کر گول گئے ج چند ایک کالے اُبے ہوئے پنوں کے ہماری پیالیوں میں رکھنے لگا۔ گول گئے کھاتے کھاتے ابن انشاء نے بڑے غور سے کھٹاس میں ڈوبے کالے پنوں کو دیکھا اور بولا۔

”یار! یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ کالے پنے کس خوشی میں ساتھ دیتے ہیں؟ یہ تو ہم بھی مانتے ہیں کہ بکری مینگھٹیاں ڈال کر وہ دھ دیتی ہے لیکن یہ دکا نڈا کالے پنے ڈال کر گول گئے کیوں دیتا ہے؟“
 میں بھر واپس کو اٹنی ریٹورنٹ میں چلتا ہوں۔

ابن انشاء میرے سامنے بیٹھا چائے پی رہا تھا اور گولی بھی چوس رہا تھا۔ سگریٹ وہ نہیں پیتا تھا لیکن کبھی کبھی — بہت شاذ و نادر — کسی دوست سے سگریٹ لے کر پی لیتا تھا۔ سگریٹ کو وہ بول آگ دکھانا جیسے ابھی بھک سے اڑ جاتے گا۔ پھر جو وہ سگریٹ کا حشر کرنا میں اُسے بیان نہیں کر سکتا کیوں کہ مجھے سگریٹ سے بہت محبت ہے اور اس کا یہ حشر دیکھ نہیں سکتا تھا۔

اس روز کو اٹنی ریٹورنٹ میں مجھے سگریٹ لگاتے دیکھ کر اُس نے غلاب معمول مجھے سگریٹ پینے سے منع کرنے کی کوشش کی:

”اے حیدر سگریٹ کی بجائے جوس پیا کرو۔“

میں نے کہا: ”جوس بھی پیتا ہوں۔“

کہنے لگا :

”وہ تو مجھے پتا ہے۔ تم امرتسری پہلوان کی اولاد ہو۔ دی کا ادھر کا بھی پیتے ہو۔ جو س پیتے تو میں نے خود تمہیں دیکھا ہے۔ بلکہ میں نے تمہیں کئی بار جس واسے کی ریڑھی کے پاس مانوں کے چھلکے کھاتے بھی دیکھا ہے۔ کیونکہ بقول کرشن چندر مانوں کے چھلکوں میں دوا من زیادہ ہوتے ہیں۔ اگر تم اس بات کا سنی سے ہر میزوں میں مانوں کے چھلکے کھاتے رہے تو ایک نہ ایک دن ضرور دودھ دینے لگو گے۔“

ابن انشاء باتیں کرتا رہا، خود بھی ہنستا رہا مجھے بھی ہنساتا رہا۔ پھر میرے افسانوں پر گفتگو شروع ہو گئی۔ میرا نیا افسانہ ”منزل منزل“ ادب لطیف کے سامنے میں چھپا تھا۔ ابن انشاء کان میں ماچس کی سلائی گھماستے ہوئے بولا :

”اس کہانی میں مجھے وہ منظر بڑا پسند آیا جہاں راجدہ ٹرپوڑھی میں بیٹھ کر چھاڑی واسے سے کھٹے مشکڑے خریدتی ہے۔“

پھر پوچھنے لگا :

”ہر راجدہ لڑکی جو ہے۔ میرا مطلب ہے کہ یہ ریمانز نہیں ہے ناں؟“

پھر خود ہی بولا۔

”لیکن ریمانز تو بقول تمہارے کیڑو کا لچ میں پڑھتی ہے۔ وہ راجدہ نہیں ہو سکتی۔ اچھا ایک بات ہے۔ کہنے یہ بھولی بھالی لڑکیاں تمہارے قریب میں بہت آجاتی ہیں۔“

میں نے کہا۔

”خدا کی قسم میں نے آج تک کسی لڑکی کو خرب نہیں دیا۔“

گرجاں ہلا کر سکاوتے ہوئے بولا۔

”بگو اس مت کو دیکھئے۔“

”تمہارے لیے چائے اور پائوں؟“

”نہیں فزٹ ایک منگواؤ۔“

ہاٹ سیٹ چائے اور فزٹ ایک بھی آگیا۔ میکلوڈ روڈ کے پمپل کے دفینوں میں ہوا سرگوشیاں کر رہی تھی۔ ابن انشاء چائے کی چمکیاں لے رہا تھا۔ میں نے منزل منزل کی ہیروئن راجدہ کی کوئی بات کی تو بولا۔

”یاد راجدہ کا جو تک نقشہ تم نے کھینچا ہے اسے دیکھ کر مجھے پھلور کی ایک لڑکی کا خیال آتا ہے۔“

بس اس سے آگے ابن انشاء نے کچھ نہ بتایا۔ اپنی رومانٹک زندگی کے بارے میں کبھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں نے سبب بھی گڑبنا چاہا، وہ ناں جاتا اور کوئی دوسری بات شروع کر دیتا ہے۔ بہت دنوں بعد جب وہ کو اچھی آچکا تھا تو اس نے مجھے ایک چھوٹی سی رومانٹک داستان سنائی۔ پھر اُس نے مجھ سے مشورہ لیا۔ میں نے ایسا مشورہ دیا کہ تختہ ہی الٹ گیا۔ ابن انشاء مجھے کہاں دہتا رہ گیا۔ ویسے اُسے گالی دینا نہیں آتی تھی۔ مجھے صرف ایک گالی دیا کرتا۔ ”امراں واسے۔“ اور یہ گالی جب بھی میں اس کی زبان سے سُنتا تو مجھے بڑی خوشی ہوتی۔ یوں لگتا جیسے وہ مجھے کوئی اعزاز دے رہا ہے۔

میں نے ابن انشاء سے کہا۔

”پڑوسوں ریمانز کا لکچیشن ہے۔ اُسے بی اسے کی ڈگری مل رہی ہے۔“

میرے ساتھ تم بھی چلنا۔ بڑا مزہ رہے گا۔“

ابن انشاء اپنی ٹائی کی گرہ ٹھیک کرتے ہوئے بولا۔

”کہنے اتم تو اس کے بھائی ہی کر چلے جاؤ گے میں کیا بن کر جاؤں گا۔“

اور میں نے ابن انشاء کو دہی گالی دی جو وہ مجھے دیا کرتا تھا۔

متاثر ہو کر کبھی تھی۔ بعد میں ابن انشاء نے اس عظیم رونا ننگ چینی شاعر کی نظموں کا منظوم ترجمہ بھی کیا جو ایڈگرائٹن پو کی کاپیوں اور نظموں کے ترجمے کے ساتھ اس کا منظم شاہکار ہے۔

۱۰ اچھا اب میں نہیں ہاں شان کی ایک چینی نظم کا ترجمہ کرتا ہوں۔

تاکہ تم مجھے اپنی مرگاہ کی باتوں سے بور نہ کرو۔

ابن انشاء ان دنوں مختلف چینی شاعروں کی نظموں کے ترجمے کر رہا تھا۔ یہ نظموں ۱۹۹۱ء میں لاہور اکیڈمی کی طرف سے چینی نظموں کے نام سے شائع ہوئیں۔ اس کا دوسرا چھ مزارعہ نے لکھا تھا لیکن وہ بتول ابن انشاء ضائع ہو گئی نظموں کی آرائش میرے چھوٹے بھائی مقصود نے کی تھی، چنانچہ اس کتاب کے شروع میں تقریب کے عنوان سے ابن انشاء لکھتا ہے۔

۱۱۔ ۱۹۹۱ء میں جہادوں کا پیر نہ تھا کہ حالات کی آمد ہی مجھے لاہور

سے اٹھا کر اچھے لائی۔ نیا شہر اٹھ لوگ۔ بہن بھیرا شہر سے دور

ایک پرانے اسپتال کی خدمت و عذاب بارگ مقرر ہوئی۔ جو مریضوں کے کام کی

مدد تھی۔ عجیب آجی مائل تھا۔ خود کشوں میں سے جو اتنی ہی میٹیاں

بھاتی مورتی۔ احاطہ میں اور بچان کے پیسے آدھ پیسے جوں سے شاہ تہا

رات کو گورا قبرستان کی طرف گئے نوستہ لاپتہ اداس کے فوجی کیمپ

کا گھڑ پال مساحت بہ مساحت پہرے دار کی مگر ہی سے جھنجھلا اٹھتا۔ تنہائی

اور اداس کا یہ صہار توڑنے کے لیے آخر ایک شب میں نے پرانے ترخانوں

کی سیر شروع کی۔ انہی میں گئے ادراک کا یہ شیرازہ مٹی چینی نظموں کے

ترجمے کا مستودہ تھا جس کی ترتیب و تہذیب صرف فقیوں کے کارن کی

جوتی تھی۔ نعت نعت کو پیشے اچھا تھے، نظم کرنے میں بیسیوں لگ گئے،

لیکن بہر حال کام انجام کو پہنچ گیا۔ جائزے گزرتے، ہجرت آنے تک

اچھا خاصا دفتر تیار تھا۔

کا فیکشن کا وقت سہ پہر پانچ بجے تھا۔

میں نے ساتھ سے تین نئے ابن انشاء کو ساتھ لے لیا۔ ہم لہٹ روڈ سے نکل

کر اسیل ہال سے ہوتے ہوئے لارنس باغ میں آ گئے۔ میرا خیال تھا کہ پہلے ہم

کچھ دیر چٹیا گھر کی سیر کریں گے۔ پھر لارنس باغ کے اپن ایر کیسے میں بیٹھ کر چائے

پینیں گے اور پونے پانچ بجے کے قریب کینز کالج کی طرف چل پڑیں گے۔ پڑھنا گھر

کی سیر کا پروگرام ابن انشاء نے یہ کہہ کر شروع کر دیا کہ اسے حید کے ساتھ ہوتے

ہوئے چٹیا گھر کی سیر کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

۱۲۔ ہاں اپن ایر کیسے میں چائے ضرور پیوں گا بشرطیکہ تم چلاؤ۔

اپن ایر کیسے لارنس باغ کی پہاڑی کے واسطے میں تھا اور وہاں سوائے

بزم دہگ کے ایک کین اور باہر لان میں بکھری دو چار کوسوں کے اور کچھ بھی نہیں

ہو کر تھا۔ ہم لان میں گھس پر ایک جگہ بیٹھ گئے۔ چائے آگئی۔ باتیں شروع ہو

گئیں۔ ابن انشاء نے مجھے ایک نظم سنی۔ چھوٹی سی معلوم سی نظم تھی۔ اب مجھے یاد

نہیں رہی۔ لیکن نظم تھے ہوتے ابن انشاء کے چہرے پر جو جھپٹن اور معصیت

جھکنے لگی تھی۔ وہ آج بھی یاد ہے اور ساری زندگی یاد رہے گی۔ شاید وہ نظم چین

کے بارے میں تھی اور اس نے چین کے قدیم رونا ننگ شاعر لی پو کی ایک نظم سے

تھا تو یہ اپنے شوق کا رخاؤ دیکھیں متفرق نظریں ادنیٰ پر چلیں
 چھیں تو لوگ توجہ ہوئے۔ ایک ناشر نے فرمائش کی کہ کتاب بنا دو۔
 یہ تھوڑا کام نہیں تھا۔ لاہور جا کر دوبارہ مثنوی سے ترجمہ کا موازنہ
 کیا صفائی اور صفائی کی طرف اور توجہ دی۔ چینی شاعری کا خاکہ
 مرتب کیا اور مثنویوں کے حالات جمع کیے مختار صدیقی میرے مہربان
 دوست نے دیا یہ کچھ لکھ دیا اور اس میں نکتہ رسی کا حق ادا کیا۔
 ہونہار آرٹسٹ مقصود نے ہر نظم کی آرائش کے لیے دلاؤ بڑے نقوش رسم
 کیے جن میں دائمی چین قدیم کی روح کشمچ آئی تھی، لیکن میرا کتاب
 میرا نفس مزاج طابع اور ناشر، سبھی جلد بازی سے لغو تھے اور اس
 مقولے کے قائل کہ جو کام کل پر ڈالا جاسکتا ہے اسے آج کیوں کیا جائے
 نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۵۷ء کی کتاب نہ آئی۔

اس دیر سے بڑا نقصان ہوا۔ یعنی مسوئے کراچی اور لاہور کے
 بار بار سفر میں آوارہ گرد ہو گئے۔ اب جو میں ڈھونڈتا تھا جوں تو کتاب
 کے پہلے اوراق تو ملتے ہیں لیکن نہ میرے پیش لفظ کا کہیں نشان ہے
 نہ مختار صدیقی کا ویجاہ دستیاب۔ مقصود کی تصویریں انہی ناشر کے
 پاس رہ گئیں جن سے گزشتہ سال میں نے کتاب کے حقوق واپس لے
 لیے۔ تھائی کے لیے قدیم شاعری پر ایک مختصر نوٹ لکھ دیا، جن کو زیادہ
 جتو جو انہیں انگریزی کتابوں خصوصاً آرتھر ویلی کے مقدموں میں بہت
 لکھ کر جانے کا بعد ہر نظموں کے متعلق اتنا کہنا ضروری ہے کہ یہ فقط اٹھ
 صدی کی جو محقق دہائی تک کی ہیں۔ ان میں مغربی جدیدیت کا ہر تو
 ہے لیکن چینی روح کے ساتھ۔

میری کوشش یہ رہی ہے کہ ترجمے اصل کے باندہ رہیں،
 لیکن شاعری رنگ و بوم کا شہر اور رچاؤ سے عاری نہ ہونے پائے۔

ان میں آپ کو اظہار کے انوکھے پیرائے اور تکنیک کی کچھ ہر مثنوی
 بھی ملیں گی۔ خدا کرے اہل ذوق کے نزدیک پسندیدہ مقرر ہیں۔
 سرودق اور انتر چو پان کا نقش دونوں۔ مقصود اور حسن کا رنگے کی
 عنایت ہے۔ ابھر جاتا ہے یا دیکھیں ادھر پر دانا آتا ہے۔

ابن انشاء

اگست ۱۹۶۷ء

یہ کتاب مجھے خوبصورت رنگین سرودق کے ساتھ چھپی۔ ابن انشاء نے
 مجھے جو کاپی دی اُس پر اپنے ہاتھ سے لکھا۔

”ریحانہ اور لے حمید کے لیے“

ابن انشاء

۲۴ فروری ۱۹۶۷ء

ابن انشاء کی طبع زاد نظموں اور غزلوں کی پہلی کتاب ”چاند نگر“ مکتبہ اردو
 نے ۱۹۵۵ء میں طبع کی۔ اس پر ابن انشاء نے یہ لکھ کر مجھے ایک کاپی دی۔

”ریحانہ لے حمید کے لیے“

ابن انشاء

۲۴ اکتوبر ۱۹۶۷ء

میری بیوی کا نام اُس نے دونوں کتابوں پر ساتھ اس لیے لکھ دیا کہ اُسے
 دیکھ کر الگ ایک کاپی نہ دینی پڑے، چنانچہ جب ایڈیٹر ابن پو کی کہانیوں کا
 ترجمہ مرکز ادب کراچی والوں نے چھاپا اور ابن انشاء مجھے اس خوبصورت اور
 قیمتی کتاب کی ایک کاپی دینے لگا تو اس پر لکھا۔

”پیارے اے حمید کے لیے“

دیتے ہوئے تکلیف تو ہوتی ہے لیکن مجبوری

ابن انشاء

گراہی ۱۸ ستمبر ۱۹۵۹ء

یہ کتابیں میرے سامنے کھلی پڑی ہیں۔ ان پر ابن انشاء کے ہاتھ کی کھٹی ہوئی تقریر ویسے کی ویسی ہے۔ کسی جگہ پر بھی سیاسی پھینکی نہیں پڑی، یوں لگتا ہے جیسے ابھی ابھی وہ ان کتابوں پر آؤگراف کھ کر اپنے ایبٹ روڈ والے مکان پر گیا ہے۔ ابھی غور و خیز میں واپس آکر میرے پاس آرام کرسی پر بیٹھ جاتے گا اور ناک پر انگلی سے ٹیک ٹیک کرتے ہوئے کہے گا۔
 "پار! یہ کتابیں تم مجھے واپس نہیں کر سکتے؟ ہاں آؤگراف میں تمہیں کسی کا پی پر لکھ کر دے دوں گا۔ اس سے بھی اچھا آؤگراف ہو گا۔"

جس کمرے میں بیٹھا میں اپنے پیارے ابن انشاء کی یادیں لکھ رہا ہوں، اس کی کھلی کھڑکی کے باہر سرو کا درخت ہے۔ اس درخت پر ابھی ایک سرخ چوڑی والی کلیل آکر بیٹھی تھی۔ وہ اڑتی ہے۔ ابن انشاء کی یادیں مجھے اپنے ساتھ اڑاتے لیے چھڑ رہی ہیں اس لیے تسلسل بار بار ٹوٹ جاتا ہے لیکن ان یادوں پر میرا اختیار نہیں ہے۔ تسلسل توڑنے کو جی نہیں چاہتا لیکن مجبوری میں کہہ رہا تھا کہ لاریش باغ کے اوپر انیر کینے میں چائے پیتے ہوئے ابن انشاء نے مجھے ہان شان کی ایک نظم سناتے کے لیے کہا۔ اُس نے کوٹ کی جیب میں سے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکالا۔ اُسے احتیاط سے کھولا۔ ناک پر ٹیک ٹیک کی اور اپنے دیمے دیمے چٹے چٹے گرم خوشگوار بھجے میں منانے لگا۔

"اکثر کوئی آکر پوچھتا ہے

کس اور یہ غنڈہ اہر بت ہے

کس راہ پہنچتے ہیں راہی

+

اس پر بت کی کوئی راہ نہیں

گرمی کے دنوں میں بھی اس کی کبھی برون پگھلتی نہیں دیکھی بس اہر کا سایہ رہتا ہے یا کہ سدا چھایا رہتا ہے تم پڑھو گے پھر میں کیسے اس کوہ پر آن بسا لوگو مرا تن ہے بھلا تم سا لوگو

+

تم لوگ اگر مجھ سے ہوتے
 میرے پاس یہاں رہتے ہوتے
 میرے پاس۔ اس غنڈے سے ہوت پر

بہار کا موسم تھا۔ لاریش باغ کے درختوں میں پھولوں کی خوشبو میں اتر رہی تھیں۔ اس زمانے میں خال خال لوگ باغوں میں جایا کرتے تھے۔ بڑا سکون تھا۔ چہاڑی پر ایک طوطا بول رہا تھا۔ سامنے مسجد کے پھوڑے لوکاؤں کے چہرے تھے۔ اُن کے اوپر سے چڑیوں کا ایک جھنڈا اُڑ کر عامرے سروں کے اوپر سے گزرتی۔ ابن انشاء نے انھیں اٹھا کر چڑیوں کے اڑتے جھنڈے کو دیکھ اور پوچھا۔
 "کیسی نظم ہے؟"

میں اُسے کیا بتانا کہ نظم کیسی تھی۔ میں تو ابن انشاء کو دیکھ رہا تھا جو خود اُس نظم میں ڈھل گیا تھا۔ ایک دھما دھما درسا تھا۔ رونا ناک کتھار سر ہٹا ہوا اُس کی آنکھوں میں سلگ رہا تھا۔ ہلکی آنکھ سی تھی جس نے اس کے رخساروں کو ممتا دیا تھا۔ مجھے جھگٹ کبیر کا رونا یاد آ رہا تھا۔

لالی میرے لال کی بت اُت دیکھوں لال

لالی دیکھوں میں گئی میں بھی ہو گئی لال

اُس وقت ابن انشاو مجھے چینی سوانح شان لک رہا تھا۔ جس نے چینی نظم کا اردو میں ترجمہ نہیں کیا تھا بلکہ وہ نظم چینی زبان میں خود کبھی غنی بہ سیرانی اور نادر کا کوری کے ترجموں کی روایت غنی جسے میں ابن انشا کے طرزِ ترجمے میں دیکھ رہا تھا محسوس کر رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے میں نے کوئی چینی نظم سنی نہیں بلکہ وہ خود میرے دل پر اتری ہے۔ میں نے خود وہ نظم کہی ہے۔ پہلے بکے در دیکھ یا گھیراؤ اور کھار سز کا یہ ملگا ذرا ابن انشا کا شری مزاج تھا۔ اس میدان میں وہ ہم عصر ترقی پسند شاعروں سے بالکل الگ تھا کبھی کبھی اُس کی شاعری پر رجعت پسندی اور دوافیت کی انگلیاں بھی اٹھائی گئیں سبھی وجہ تھی کہ جب کبھی وہ میرے ساتھ لاہور شہر کی پڑاوار گلیوں کی سیر دیا تھ تو کبھی تو کسی سے اس کا ذکر نہیں کیا کرتا تھا۔ اس خیال سے کہ اُس کے ہم عصر ترقی پسند دوست اُسے رجعت پسند یا دوا ننگ نہ سمجھتے گئیں۔ کیونکہ پرانی گلیوں، قبرستانوں اور پھانسی یادوں کا ذکر کرنا اُس زمانے کے ترقی پسند دانشوروں کے نزدیک انتہائی رجعت پسندی کی بات تھی۔

دوا ننگ ہونے کے ساتھ ساتھ ابن انشا نو زبردست سیاسی شعور کا مالک تھا۔ اُسے چینی سے لے کر چین تک کی تمام سیاسی اور ادبی تحریکوں کی پوری پوری خبر ہوتی تھی۔ اُسے پوری تفصیل کے ساتھ علم ہوتا تھا کہ کس ملک میں کون سی مزدور تحریک، کسان تحریک اور سیاسی تحریک زوروں پر ہے اور کہاں کہاں بیٹھا کون کون سی تحریکوں کے بارے میں کھڑا ہے۔ ابن انشاو کی وجہ سے یہ جراثیم میرے اندر بھی پیدا ہونا شروع ہو گئے تھے۔ میں نے بڑی شکل سے ان سے بیچھا چھڑایا، لیکن ابن انشا انتہائی گہرا دوا ننگ ہونے کے باوجود شدید قسم کا ترقی پسند بھی تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس ترقی پسندی کے جراثیم چھوڑے اپنے ساتھ لے کر چلا تھا۔ جبکہ میں امرتسر سے سواتے کمپنی بانگ کی خوشبو توں کے

اور کچھ بھی ساتھ نہیں لایا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ ابن انشا نے اپنے گاؤں کے درختوں پر بسنے والے طوطوں کو یاد رکھا تھا، چنانچہ جب میں نے ابن انشا کو کمپنی بانگ کے درختوں سے طویا تو اس نے اپنے گاؤں کے طوطے لاکر اُن پر بٹھا دیئے اور دلِ زندگی کے کپکنی بانگ میں ہم ہاتھ میں ہاتھ ڈالے سیر کرنے لگے۔ ایک روز ہم دوسرے دوستوں کیساتھ سویرا کے میلو ڈروڈ والے دفتر میں بیٹھے تھے۔ عبد الحمید جی اپنی کوئی نازہ نظم سنا رہے تھے جسے چوہدری نذیر بڑے غور سے سن رہے تھے کیونکہ انہیں یہ نظم سویرا میں شان کوئی تھی جب کبھی میں ان درون شہر کی سیر کے رجعت پسند مسافر پر احباب کی مجلس سے اٹھ کر جانا ہوتا تو ہم ایک دوسرے کو خاص اشارہ کیا کرتے تھے۔ ابن انشا نے بائیں ہاتھ کی انگلی دائیں ابرو کے اوپر دو تین بار ملگا کہ مجھے اشارہ کیا کہ چلو دوست ان درون شہر موگشت کو نکلیں۔ میں آوارہ گردی کے لیے ہر وقت تیار رہتا تھا اور خاص طور پر اس وقت کو بہت زیادہ تیار ہوتا۔ جب کوئی شاعر نظم سنا رہا ہو اور چوہدری نذیر غور سے من رہے ہوں۔

پہلے میں اٹھ کر نیچے آگیا۔ غصہ بڑی دیر بعد ابن انشا بھی میز چھیاں اُترتا بازار میں آگیا۔ وہ یوں خوشی سے لال ہوتا تھا جیسے کسی بچے کو سکول سے اچانک چھٹی مل گئی ہو۔ ہم دیال سنگھ کا بیچ کے آگے سے گزر کر گوالڈی کی گلیوں میں داخل ہو گئے۔ ابن انشا نے میرے کندھے پر ہاتھ دیکھ کر کہا۔
"وہیے اسے جیسے تمہیں بھی صاحب کی نظائیں غور سے سننی چاہیں۔۔۔"
"نظائیں نہیں سونگے تو تمہارا سیاسی شعور بالغ کیسے ہوگا؟"

میں نے ابن انشا کی پانچھ پڑوسرے ملکا مارتے ہوئے کہا۔

"تمہارے سیاسی شعور کی ایسی کی تیس۔۔۔۔۔"

موجی دروازے میں داخل ہوتے ہی ابن انشا نے اپنی جیب توگھولیں اور پوڑیوں سے بھری۔

”تم بھی اپنی جیب بھراؤ کیسے! میں تمہیں ایک بھی نوگ بھلی یا ریوڑی نہیں دوں گا۔“

لیکن سارا راستہ وہ مجھے اپنی جیب میں سے نوگ بھلی ریوڑیاں کھلاتا رہا۔ ہم شہر کے گجان علاقے کی ایک نیم روشن چھتی ہوئی گلی میں سے گزر رہے تھے کہ گانا، ایک پرانے مسجد کا دروازہ نظر آیا۔

”یار یہ تو مجھے الف بیل کے بغداد کی کوئی مسجد معلوم ہوتی ہے۔ اس کے اندر چنانچا ہے۔“

ہم تختہ آثار مسجد میں داخل ہو گئے۔ شاہد سلاطین کے دور کی مسجد تھی۔ دیواروں پر رنگین پھولوں کے نقش اکھڑے تھے۔ منچ میں ایک خوش تھا جس کے بڑائی میں پھیلاں تیر رہی تھیں۔ فراروں میں مندرے اوپر کوپٹے ہوئے تھے۔ بڑی پرانی اور ٹھنڈی ٹھنڈی برسکون مسجد تھی۔ ابن الشاء بار بار چپچپے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے پوچھا کہ وہ سو کر کیا دیکھتے ہیں۔

الف بیل کے بغداد کی مسجد ہے۔ ڈرنا ہوں کوئی بغدادی چور پیچھے سے آکر ہمارے ہوتے دے آئے۔

ان پر اسرار چھتی ہوئی گلیوں کی سیر کرتے کرتے ہم باندہ سید متاع مل گئے۔ یہاں سے پانی والا تالاب آگئے اور پھر وائیں گھوم کر سہری مسجد، ڈبی بازار کی سیر کرتے ڈرگلی میں سے گزر رہے تھے کہ ابن الشاء نے کہا۔

”قبائے ساتھ ان پر اسرار گلیوں کی مٹ گشت میں بہت مزا آتا ہے۔ دوسرے لوگوں کو ان باتوں سے دلچسپی ہی نہیں ہے ارے گلیوں کی آواز گروئی نہیں کریں گے تو مکھیں گھکیا خاک؟“

ایک تنگ گلی میں سے گزرتے ہوئے ہم نے ایک مکان دیکھا جس کی شانین کی محراب پر کوئی، میں چڑھتی ہوئی تھی۔ ابن الشاء نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ

کر کہا۔

”دیکھو۔ یہ کوئی قرطبہ کی گلی لگتی ہے۔“

کسی روز ہم ریوڑے شیش کی طرف نکل جاتے اور مل پر کھڑے ہو کر ریل گاڑیاں دیکھتے۔ ابن الشاء مجھے بتایا کرتا۔

”ہمارا گھر ریوڑے شیش کے قریب ہی تھا۔ میں شام کو سیر کرتے کرتے ریوڑے شیش کے پل پر آ جاتا اور دیر تک ریل گاڑیوں کو آتے جاتے دیکھا کرتا۔ چھک چھک کرتا۔ انجن صرف رنگ کی ریل گاڑی کو لیے آتا۔ پل کے نیچے سے گزرتا۔ میں انجن کے دھوئیں سے بچنے کے لیے بڑے جھٹ جاتا اور پھر گاڑی دور شام کے اندھیروں میں گم ہو جاتی۔ ریل کی سیٹی کی آواز آتی بھی میرے دل میں پرانی یادوں کو میلا کر مرقی ہے۔“

چاند کو دیکھ کر ابن الشاء کھڑا جاتا تھا۔ مجھے وہ رات آج بھی یاد ہے شاید ہم پاک تری ماؤں سے واپس ایبٹ روڈ کی طرف آرہے تھے کہ میکوڈکے چوک میں پہنچ کر ہم نے گول گول پڑا اسرار کچھ زرد کچھ سرخ چاند کو شعلہ پانڈی کی جانب سے طلوع ہوتے دیکھا۔ ابن الشاء ٹھٹھک سا گیا اور چاند کو دیکھنے لگا چاند کے پیارا نہیں لگتا، لیکن ابن الشاء پر چاند نے جا دو سا کر دیکھا تھا۔ وہ چاند کو یوں دیکھتا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہے اور جیسے چاند بھی دھرتی کے آفت پر پہلی بار بطور جور رہا ہے۔ چاند کی کریمز ابن الشاء کی زندگی کے ساتھ ساتھ سفر کرتی رہی، چنانچہ اُس نے پہلے شعری جوتے کا نام بھی چاند بخرا رکھا۔

”اے سید! میں نے چاند کو آ باد یوں، دیوانوں اور کھیتوں میں بھی دیکھا ہے۔ ہر مقام پر اس کا روپ، اسی چھب الگ ہوتی ہے۔“

ہمارے اس وقت کے ہم عصر کرتی پسند و انشوروں کے نزدیک چاند غرض ایک چمڑا گول جھڑا تھا۔ جو زمین کے گرد چکر گارہا ہے لیکن ابن الشاء کو اس

پتھر کے سینے میں کوئی ذی روح ساٹس لینا محسوس ہوتا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ چاند پر ہمیاں رہتی ہیں۔ سینہ بالوں والی بوڑھیا چڑھ کر تکی ہے۔ غرابوں کی قبائل انگریز وادیاں ہیں اور ہری بھری گھاس کے پٹے بڑے بڑے تختے پھیلے ہیں جن پر شام کو سفید چھوٹوں کی بارش ہوتی ہے اور پھلے پیر آسانی دیوایاں عشق و مر جان کے زور پر سینے میر کو نکالتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اُسے یہ بھی یقین تھا کہ یہ خواجہ خضر یا الازدین کے چرام کا دور نہیں ہے۔ کوئی عجزہ و قوس پذیر نہیں ہو گا۔ تعویذ گندے بچاروں کو دور نہیں کر سکتے۔ دعاؤں کوئی اثر نہیں رکھتیں۔ ایہ میں آج سے ستائیس برس پہلے کے ابن انشاء کی بات کر رہا ہوں اور ایشیا والوں کو کسی مہدی نساں یا دانائے راز کا انتظار نہیں کرن چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ اندر سے خود ابن انشاء کو کسی مہدی زمان یا دانائے راز کا انتظار تھا۔ وہ خود کسی خواجہ خضر یا الازدین کی تلاش میں تھا لیکن اس راز کو اُس نے اپنے سینے کی گہرائیوں میں دفن کر رکھا تھا۔ میں اس کی آئیڈیلزم دیکھتا تو اُس کی حقیقت پسندی، یا ترقی پسندی پر شک ہونے لگا۔ اُس کی ترقی پسندی دیکھتا تو اُس کی آئیڈیلزم پر فزوعات کا لگان ہوتا میرا خیال ہے کہ ابن انشاء کی آئیڈیلزم اور حقیقت پسندی کے درمیان چاند خاں ہو گیا تھا۔

ایک بار میں کراچی گیا اور ابن انشاء کے ہاں جھرا۔ ان دنوں وہ جاگیر روڈ پر رہتا تھا۔ ابن انشاء ڈائرینگ روم والے آہنی پتنگ پر بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ میں سامنے صوفے پر بیٹھا اُس سے گفتگو کر رہا تھا۔ اُسے پھر وہ رہا تھا۔ پھر میں اٹھ کر اُس کے پتنگ پر آگیا اور اُسے تنگ کرنے لگا۔ ہم نے شفی مڑنی شروع کر دی۔ میں نے اُسے بازوؤں میں دبا لیا۔ ابن انشاء مجھے بار بار اپنی دیہی اکوٹی گالی دے رہا تھا۔

”اوسے تمام زالوسے، اوسے تمام زالوسے.....“

اچانک میں نے کہا۔

”ابن انشاء تمہارے سر سے مٹی کے تیل کی بو کیوں آرہی ہے؟ یہ تمہارے بالوں میں کون سی امیر کیریم لگا رکھی ہے؟“

کہنے لگا۔

”کیسے، ہم سب کا ابا مٹی اور پھر اس کا تیل ہے۔“

میں نے کہا۔

”نہیں یا ر! ایسا نہیں ہونا چاہیے۔“

ابن انشاء کھڑکی کے شیشوں سے باہر نکلے لگا۔ زبان سے اس نے جو فقرہ ادا کیا تھا اُسے اس کا دل نہیں مال رہا تھا۔ میں نے کچھ ایسا ہی محسوس کیا۔ یہاں سے اس کا چاند نگر کا سفر شروع ہوتا تھا۔ یہاں اُس کے اور اُس کی حقیقت پسندی کے درمیان چاند خاں ہو جاتا تھا اور وہ چاند کی وادی میں جواہرات کے بیوسات والی پیدیاں اترتے دیکھتا تھا یا دیکھتا چاہتا تھا۔ بہر حال جو کچھ بھی تھا کوئی نہ کوئی بھید، کوئی نہ کوئی اسرار موز تھا جس کی پہلک ایسے لمحات میں ابن انشاء کی آنکھوں میں آنکھ کرنا تب ہو گئی۔ جیسے وہ اس سوچ میں ہو کہ اگر چاند ماضی ایک مادہ ہے تو پھر اس کی روشنی کیا ہے؟ اور اس روشنی میں اترنے والی شمع چشم پریاں کیا ہیں؟

چونکہ یہ باتیں ابن انشاء کی شخصیت کا ایک حصہ تھیں اس لیے انہیں جستہ جستہ بیان کر رہا ہوں۔ بلکہ جتنا کچھ سمجھ سکا اتنا بیان کر رہا ہوں وگرنہ مقصد ابن انشاء کے فن شعری بحث نہیں ہے۔

ہاں تو میں کاؤنکیشن کی شام کا ذکر کر رہا تھا۔

اوپر ایسے کہنے میں کچھ دیر بیٹھنے کے بعد ہم دونوں اٹھے اور کینڑ کا کاج کی طرف چل پڑے۔ کینڑ کا کاج میں بڑی رونق تھی۔ غروب ہوتے سورج کی مالی سنے کاج کے اونچی چھتوں والے برآمدوں میں سرخ روشنی پھیلا رکھی تھی۔ لہجہ کر گئے۔ ”خدا! ہمارے پتھروں کے چراماں روشن تھے اور چٹائیوں کی

چہکا گوج رہی تھی۔ ہاں کی جانب سے آگن کے سر بلند ہو رہے تھے کاندھوں کی قریب بڑی سادہ مگر پتہ و قار تھی۔ بسنڑ کیوں نے بالوں میں پھول سجائے رکھے تھے۔ آگن کی موسیقی آدیتے سورج کی سرخی انگنے درختوں کے سرخ پھول اور عصم چلیے چہرے اور قم قم کی انگلش اور فرانسس خوشبو تھی۔ یہ سب کچھ میں خواب کی طرح گم رہا تھا۔ واپسی پر ہم لارنس باغ میں سے ہو کر گزرے۔ بہار کی رات کے ساتھ خوشبو تھی بن کر جھاڑیوں میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ ہم اوپن ایر کیفے میں چائے منگوا کر بیٹھ گئے۔ ابن الشاء خاموش تھا۔ پھر وہ پالی میں ججی ہلاتے ہوئے ہوا۔

”مجھے ایلن پوک کی نظم ’گھنٹیاں‘ یاد آ رہی ہے۔ بڑی اسراری نظم ہے۔ میں اس کا ترجمہ کر رہا ہوں۔“
 پھر وہ ایڈگر ایلن پو پر باتیں کرنے لگا۔
 ”تم نے پوک کی نظم ’ایو ریکا‘ نہیں پڑھی؟ اس نظم میں پونے کائنات کی تخلیق اور نظریۂ کائنات پر بات کی ہے۔ پیراڈا اسرار کیا ہے۔ ہم جس کائنات میں سانس لے رہے ہیں یہ ہمیں ساتھ کے کرکوشی منزل کی طرف جا رہی ہے۔“

ابن الشاء ایڈگر ایلن پو کا ذہن دست مارت تھا۔ اس کی نظموں، اسرار کی کہا نیوں اور مزاح نگاری کا والد و شہیدا تھا۔ اس نے پوک کی کہانیوں کا ترجمہ بھی کیا جو مکتبہ فریگلن کے اشتراک سے مرکز ادب کراچی کی جانب سے اندھا کنواں اور دیگر پراسرار کہانیاں کے عنوان سے چھپا۔ اس کتاب کے دیباچے میں ابن الشاء نے لکھا ”ایڈگر ایلن پو اسرار کی کہا نیوں میں اسٹیوٹن کا شیل ہے۔ رابع رسانی کے ادب میں کانن ڈوائیل کا پیش رو۔ سانس رنگ کے انسانوں میں ایچ جی ویلنگٹن کا گورو اور لکھا ہی مضامین میں اسٹیفن ہاک کا استاد اور شاعری میں تراویب اور خیال دونوں پہلوؤں سے اس کا پڑھنا تھا۔“

اُٹھتا ہے کہ ہم کسی دوسرے ایک شاعر کی نظیر پیش نہیں کر سکتے۔ میں نے پوک کو جوشہ اپنے گورو پوک کی حیثیت دی ہے۔ مجھے اسکول کے زمانے میں بھی پوک کی نظموں اور کہانیوں سے اتنا شغف تھا کہ دوستوں نے میرا نام ایڈگر ایلن پو رکھ دیا تھا۔“

رات گہری ہو گئی۔ لارنس باغ کے درختوں سے اوس کے سوتے سوتے پودے گرے گئے تھے۔ بجلی بھی ہو گئی تھی۔ رات کی شبی نفا میں باغ کے پڑا سرا چھپے ہوئے پھولوں کی خوشبو کھل مل گئی تھی۔ ہر سانس کیساتھ کسی گلاب کی چنبیلی کسی مومسری کی جبک سیٹھ میں جاتی تھی۔ اور ہر نیلانس موتیا اور رویں کے پھولوں کی خبر لاتا تھا۔ چلتے کی تھی، سگریٹ کا اروما اور سفید کیوں کی خوشبو نے ہمیں اپنے ہاتے میں لے لیا تھا۔

ہم لارنس باغ کی روٹوں پر سے ہوتے ایٹ روڈ پر آ گئے۔ میں نے ابن الشاء کو اس کے گھر چھوڑا اور خود کافی ہاؤس کی طرف نکل گیا۔

کوئی حزل نہ تھا۔ سراسر لہجہ لہجہ کوئی نظم نہ تھا اور نہیں اپنے کسی افسانے کی بات کرتا۔ بس لہجہ باری ہوتی۔ ہنس ہنس کر ہماری آنکھوں میں پانی آ جاتا۔ ابن انشاء کوئی ایسی بات کرتا کہ ہمیں سے دوبرے ہو جاتے۔ میں ابن انشاء سے پٹ جاتا۔ کسی وقت اُسے اٹھایا۔ وہ ایک اداقت سے جینک بٹھالے بار بار یہی کہتا۔
 "اوتے چھڑوے کھنے۔ اوتے میری جینک۔"

مناذریٹورٹ کی باتیں یاد نہیں رہیں۔ ہاں اتنا ضرور یاد ہے کہ وہاں بات میں سے بات نکلتی تھی۔ آوازیں بہت چبچبہ رہ گئی ہیں، لیکن ان کی بازگشت یادوں کے ایوانوں میں آج بھی گونج رہی ہے۔ شکلیں وہیں کی وہیں آنکھوں کے سامنے ہیں۔ یہ ابن انشاء کوئی شرارت کو رہا ہے۔ وہ سراسر لہجہ لہجہ چائے پی رہا ہے اور یہ حمید اختر جوئل کے دروازے میں داخل ہو رہا ہے اور ہماری طرف دیکھ کر وہیں سے ہاتھ ہلا رہا ہے۔ گوری ہوئی ان غصوں کے نقوش آج بھی شکستہ ہیں جس طرح ابن انشاء کے ہاتھ کے کچھ ہوتے آؤ گراف کی تحریر تو تازہ ہے۔ سامنے کا سارا ہال اسی طرح بچا ہوا ہے۔ ساری کی ساری وادی اسی طرح سرسبز و آباد ہے۔ ہاں اس ہال میں چلنے پھرنے والے اس واوی کی ہری بھری ردشوں پر میر کرنے والے چہرے نظروں سے اوجھل ہو رہے ہیں۔

توندہ ظریف سے فکر تو نسوی بھی لا ہوا آگیا۔

ہم نے نائل پارک کی ایک بلڈنگ کے چلے پورشن پر قبضہ کر لیا۔ یہاں فکر تو نسوی، میں، احمد اہی اور عاتق عبدالعزیز رہتے تھے۔ فکر تو نسوی نے بعد میں ایک کتاب کھلی تھی چٹا دیا۔ اس کتاب میں اس بلڈنگ میں گزارے ہوئے دنوں کا اس نے بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اس پورشن میں سوائے ایک صوفے اور ایک پنڈک کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ کارنس پر کاشی کا ایک پیالہ بڑا دھکا گیا تھا۔ ابن انشاء اس پیالے کو دیکھ کر کہا کرتا۔

"یہ وہی پیالہ ہے جس میں سقراط نے زہر پیا تھا۔"

ساحر لہجہ لہجہ بھی لہجہ والدہ ماجدہ کے ساتھ لا ہوا آگیا۔

اُسے نشاط سینا کے سامنے اور ابن انشاء کے ساتھ والے لال مکان کا پھلا پورشن لالٹ ہو گیا۔ یہ پرانا خستہ ال مکان تھا۔ ساحر لہجہ لہجہ کے کہنے کی دیواروں کا پستر جگہ جگہ سے اکھڑا رہا تھا اور چھت کے کولڑوں میں جلنے لگ رہے تھے۔ اس کے غسل خانے میں بڑی سین تھی۔ ٹونٹی میں سے پانی مسلسل گرتا رہتا۔ ساحر غسل خانے کے حلق میں آئینہ رکھے ٹیو بنایا کرتا۔ ابن انشاء سے ساحر لہجہ لہجہ اور حمید اختر کی پرانی یاری تھی۔ وہ بڑا خوش ہوا۔ اب ہم اگلے پاک ٹی ہاؤس جاتے اور غسل گرم کرتے۔ ساحر لہجہ لہجہ کی کتاب نکلیاں، نئی نئی چھپی تھی۔ نیا ادارہ والوں کی طرف ساحر لہجہ لہجہ کے اور کتبہ اردو کی طرف کچھ میرے پیسے نکلتے تھے ایک روز میں ابن انشاء اور ساحر لہجہ لہجہ ایڈٹ روٹے سیدھا لہجہ لہجہ دروازے آئے۔

پندرہ میں روپے ساحر لہجہ لہجہ نے نیا ادارہ والوں سے لیے۔ دس پندرہ روپے میں نے کتبہ اردو والوں سے لیے اور ہم انارکلی کے ممتاز ہوسٹل میں جا کر بیٹھ گئے۔ یہاں اُن دنوں بڑے زور کی دیکار ڈنگ ہو کر تھی۔ اس شور میں بھی ہم بڑے سکون سے باتیں کیا کرتے۔ شور کی طرف دھیان ہی نہیں جاتا تھا۔ اس ہوسٹل میں ہم ٹیکس میٹریاں اڑاتے۔ بڑی گرم جوشی سے باتیں کرتے تھے ابن انشاء

کسی روز ساحر لہوینا لڑی بھی نہیں دات بسر کرتا۔ فکر تو سنوئی میں اور احمد راجا
خانی پٹنگ پر سوتے۔ عادت حوسنے پر پڑ جانا اور کسی روز ساحر پٹنگ پر اور میں
فرش پر سو جانا۔ ایک رات سگریٹ ختم ہو گئے۔ پیسے بھی ختم ہو گئے۔ ہم کو لڑوں
کھدروں میں سگریٹوں کے لٹے ڈھونڈھ کر پیتے رہے۔ سگریٹوں کے ٹھوسے
بھی ختم ہو گئے۔ رات آدمی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ ہم باقیں کرتے کرتے سو گئے
رات کے پچھلے پہر میری آنکھ کھلی تو مجھے فضا میں سگریٹ کی بو محسوس ہوئی۔
میں نے احمد راہی کو جگا کر اس کے کان میں سرگوشی کی۔

”کوئی سگریٹ پی رہا ہے۔“
احمد راہی نے فکر تو سنوئی کو دیکھا۔ وہ گھوڑے نیچ کر سو رہا تھا۔ اُس
نے کہا۔

”سوائے ساحر لہوینا لڑی کے اور کوئی نہیں ہے۔“
ہم پٹنگ سے کھسک کر حوسنے کی طرف گئے۔ دیکھا کہ دیوار کی طرف منہ
کئے ساحر جتنی میں سگریٹ دباتے ہوئے ہوئے بڑے قنقر کش لگا رہا تھا۔ ہم نے
ایک دم چھاپ مار دیا۔ ساحر نے ہنستے ہوتے کہا۔

”یار ایک لڑتا میری عیب سے نکل آیا تھا تو تم بھی کش لگا لو۔“
فکر تو سنوئی اور راجا بھی جاگ پڑے۔ ہم نے ساحر کو خوب زدوکوب کیا۔
رات کا باقی حصہ ہنسی ہنسی کی باتوں میں گزر گیا۔ کچھ دنوں بعد میرا بھی اچھڑ گیا۔
فکر تو سنوئی ولی چلا گیا۔ عادت کو پسینا اخبار میں مکان الاٹ ہو گیا۔ احمد راہی
گوالندڑی کے ایک مکان میں آ گیا اور ساحر لہوینا لڑی اپنے اسی نشاط سینما
والے سرخ مکان میں اچھڑ گیا۔

اب ہماری طاقتیں سویرا کے دفتر میں ہوا کرتیں۔

سویرا کا دفتر ابھی بیکنوڈ روڈ کے چوک میں گیا بھون کے ایک کمرے میں
تھا۔ یہ دفتر تقریباً سبھی ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں اور دانشوروں کی آماجگاہ

ہو گیا۔ انہیں ترقی پسند مصنفین کے اجلاس پاس ہی دیوال سنگھ کالج کی لائبریری
میں ہوا کرتے تھے۔ بعد میں سویرا کے دفتر میں بھی چند ایک اجلاس ہوئے۔
اس دفتر کے نیچے ایک ریسٹورنٹ تھا۔ اس کا نام ہیرو ڈائیز ریسٹورنٹ تھا۔ یہ
ترقی پسندوں کا گڑھ تھا۔ مہمن لطیف اسی ریسٹورنٹ کی گیلری میں امرن انباد
پچھا کر نماز پڑھا کرتے تھے۔ اس بونٹ کا مالک ادیبوں شاعروں کا بڑا احترام کرتا
تھا۔ جوش اعلا دیب اور کھارک جینے کا بل ادا نہ کرتا یہ حضرت اس کا نام بونٹ کے
باہر گئے بیک اور ڈپر جلی حروف میں کھ دیا کرتے۔ ایک دفعہ ریسٹورنٹ کی گیلری
میں ایک بڑے ٹوٹے قسم کے شاعر اپنا طویل کلام سنا رہے تھے کہ بتی چل گئی۔ انہوں
نے نکل د انشدین سے بیاض میز پر رکھی ادیب عیب سے ماچس نکال کر دیلا سیال
جلا جلا کر اپنا کلام سنا شروع کر دیا۔ ساری ماچس ختم ہو گئی۔ بیاض کی کچھ نعلیں
ابھی باقی تھیں کہ بتی آگئی۔

کیا دیکھتے ہیں کہ ساری گیلری خالی پڑی ہے اور وہ اکیلے بیٹھے ہیں۔
دوسرے دن میں نے ابن انشاء کو یہ واقعہ سنایا تو وہ اپنی موٹی موٹی آنکھیں
گھما کر بولا۔

”اچھا۔ جب ہی میں بھی کہوں کہ یہ ہیرو ڈائیز ریسٹورنٹ کے مالک کو کیا
ہو گیا ہے کہ گریبان چھڑے، بال بھرنے سبب کوئی کرنا ٹھک رہا ہو
کی طرف بھاگا جا رہا ہے۔“
میں نے حیرانی سے پوچھا۔
”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ اب پتہ چلا۔ بتی آنے کے بعد شاعر نے ہیرو ڈائیز ریسٹورنٹ
کے بیٹے مالک کو پکڑ لیا اور لیتنا باقی بیاض اس پر ختم کر دی ہوگی۔
دگر نہ اُس شریف آدمی کا یہ حال کاہے کہ ہوتا!“

اُسی نائنے کا ذکر ہے کہ ضلع بہاولپور میں انتخابات ہوئے۔ اس کی ٹہریتیں

چھاپنے کا کچھ کام چودری نذیر مالک سویرا نے بھی لے لیا۔ یہ فہرستیں کتابت ہونے کے بعد تھوڑی چھٹی تھیں۔ چودری نذیر کو (خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرنے) امیر اودا احمد راہی کا بڑا خیال رہتا تھا۔ ایک روز ہم دونوں کو میٹھوڑ روڈ والے سویرا کے دفتر میں سامنے بٹھا کر کہا۔

• آوارہ گردی ہی کرتے رہو گے یا کوئی کام بھی کر دو گے۔ میرے پاس ہدیہ بہاد پور کی فہرستیں چھپنے کو آئی ہیں۔ اس کی کتابت خط نسخ میں ہوگی جو میرے خیال میں تم دونوں بڑی آسانی سے کر لو گے۔ ایک کاپی سولہ صفحے کی ہے اور فی کاپی کتابت شدہ دس روپے اجرت ہوگی۔

کل سے میرے دفتر میں بیٹھ جاؤ اور کام شروع کر دو۔

میں اودا احمد راہی دونوں سویرا کے دفتر میں درمی پڑھ گئے اور نرو کا فز پر شکستہ خط میں کتابت شروع کر دی۔ فہرستوں میں دوٹ وہندہ کا نام ولایت پیشہ اور عمر درج تھی۔ مصیبت یہ آن پڑی کہ عمر اودو کے ہندسوں کی بجائے خدا جانے کون سی زبان میں کھنی تھی۔ کہیں لکھ لکھا تھا تو کہیں مح لکھا تھا۔ شروع شروع میں ہم نے بڑی دیانت داری سے کام لیا اور چودری صاحب نے ان جناتی ہندسوں کی مع توجہ لیٹ بنا کر دے دی۔ مگر اس لیٹ کو پڑھنا بھی درد سر تھا، چنانچہ اب میں نے یہ کیا کہ عمر کے خانے میں جو بی میں آتا لکھ دیتا۔ اگر آپ کی عمر ہندہ برس لکھنا تو بیٹے کی عمر پچاس برس لکھ جاتا۔ ماں کی عمر گیارہ برس لکھنا تو بیٹے کی عمر ساٹھ برس لکھ دیتا۔ پہلے دن میں ایک کاپی جڑی شکل سے کھنی گئی تھی۔ جب سے میں نے اپنے فارمولے پر عمل شروع کیا، دن میں دو بلکہ تھوڑی کاپی جس کھنی جانے لگی۔

انچاس پچاس میں ہندہ روپے میں روپے روز کی آمدنی بہت ہوا کرتی تھی۔ ایک روز ابن انشاء دفتر میں آیا تو ہمیں کاتبوں کی طرح دیوانے سے ٹیک لگا لے زانو پختی رکھنے کا بت کرتے دیکھ کر بڑا خوش ہوا۔

اب ہمیں اصل کام ملا ہے :

جب آئے معلوم ہوا کہ ہم روز ہندہ میں روپے کھیلتے ہیں اور کتابت کے لیے خوش فوہیں شرط نہیں ہے تو کہنے لگا۔

• لاؤ میں بھی ایک آدھ کاپی لکھ کر دیکھتا ہوں۔

ابن انشاء کا خط پڑھا اچھا تھا۔ اُس نے ایک صفحہ ہمارے پاس بیٹھ کر لکھا۔

چودری صاحب نے اُسے پسند کیا۔ میں ابن انشاء نے بھی کتابت شروع کر دی۔ وہ جناتی ہندسوں کی لیٹ کو بڑے حذر و نرس سے پڑھ چڑھ کر کاپی میں لکھتا تھا۔ اور میں ذرخیمے جارہا تھا۔ میری طرف تعجب سے دیکھ کر بولا۔

• اوئے! تم ان ہندسوں کی تحریر کو کیسے پڑھ بیٹے ہو؟ ہمیں یہ

آپنی جلدی پتا چل جاتا ہے کہ لکھنا یا نہ سے کیا ہندسہ بنتا ہے۔

میں نے کہا۔

• پندرہ مشق کی بات ہے اور پھر میں امرتسر میں ایک ہندو تہم سے

لٹنے سے لکھا کرتا تھا۔

ابن انشاء بڑا متاثر ہوا۔ وہ دن میں بڑی شکل سے آدمی کاپی لکھتا تھا

اُس پر میری عیاری کا بھید کھل گیا۔ میری گردن دلوچ کر بولا۔

• عمر امراؤ نے! تو باب کی عمر اٹھارہ سال اور بیٹے کی عمر ساٹھ سال لکھ

رہا ہے۔ یہ انتخاب ہوں گے کہ غدر پچے گا؟

میں نے آنکھ مار کر کہا۔

• غدر پچے گا۔

ابن انشاء نے غدر چھپانے میں میرا ساتھ دیا۔ وہ دو ایک کاپیاں کتابت کرنے کے بعد بھاگ گیا۔ بہر حال میں نے پوری محنت تو دے داری اور لکھاری سے انیس تیس کاپیاں کتابت کر کے چودری صاحب کے حوالے کر دیں۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ کسی وجہ سے انتخابات ہی متوی ہو گئے ورنہ بقول ابن انشاء ہدیہ بہاد پور

میں ایک بار تو مدح پڑ جاتا۔ کیونکہ بت کے آخری مرحلے میں پہنچ کر میری طبیعت میں بڑی جرات آگئی تھی اور میں نے مذکورہ کنوٹ اور کنوٹ کا ذکر باندھنا شروع کر دیا تھا۔ یعنی کریم بخش کو بہت شادان بی بی اور رحمت خان کو ولد شریفان بی بی لکھ دیا تھا۔

ابن الشاء کا م ذیلی اور ساوہ باجاوہ اردو نویسی کے سلسلے میں چراغ حسن حسرت صاحب کو اپنا استاد مانا تھا۔ ابن الشاء کو حسرت صاحب کے آگے باقاعدہ زانوئے تلمذ تہہ کرنے میں نے نہیں دیکھا، لیکن اتنا مزہ دیکھا کہ وہ حسرت صاحب کا احترام اتنا سمجھ کر کیا کرتا تھا۔ حسرت صاحب کا مزاج کالم حرف و حکایات ابن الشاء کا پسندیدہ کالم تھا۔ وہ مجھے پڑھ کر سنایا کرتا۔ خود بھی ہنستا اور مجھے بھی ہنسیا کرتا۔ ابن الشاء کے ہنسنے کا انداز بالکل بچوں کیسا لالائی اور تصنع سے پاک تھا۔ ہنسی اس کے اندر سے پھل جڑی بن کر چھوٹی اور وہ ہنسنے ہنسنے سر کو پیچھے کر لیا کرتا۔ پھر سر آگے کر کے ہنستا اور گردن کو پیچھے جھکا لیتا۔ اُس کے ہنسنے بڑے چھوٹے چھوٹے اور بے ساختہ ہوتے۔ زیادہ ہنسی آتی تو وہ اٹھ کر کھڑا ہو جایا کرتا۔ کوئی پکڑ لبتہ کا نہ سے پڑا لے سکول جا رہا ہوتا۔ تو ابن الشاء اُس کی طرف دیکھ کر مزہ بناتا اور پھر خود ہی ہنس پڑتا اور انھیں شرارت سے چککنے لگتیں۔ کسی وقت امروز کے دفتر میں چراغ حسن حسرت کے کمرے میں بیٹھے ہوتے تو ابن الشاء بڑا سنجیدہ ہوتا۔ ہاں البتہ حسرت صاحب کی تیز باتوں پر وہ خوب ہنسا کرتا اور اپنی باتوں سے حسرت صاحب کو بھی ہنسیا کرتا۔ حسرت صاحب ابن الشاء سے بہت پیار کرتے تھے اور وہ اپنے اس جہنما شاگرد کی غذا و ذہانت اور اسلوب نگارش سے بہت متاثر تھے۔ ابن الشاء 'امروز' میں مضامین بھی لکھا کرتا تھا اور اس کے ترجمے بھی شائع ہوتے تھے۔ ترجمے میں ابن الشاء غلط و اختراعات نہیں لے پوری اور مولانا ظفر علی خان کی روایت کو لے کر آگے بڑھا تھا۔ ان دنوں امروز میں جو مضامین چھپتے ان کا معاوضہ سات روپے فی کالم کے حساب سے ملتا تھا۔ اب

جو میں واقعہ آپ کو سنا رہا ہوں میرے ساتھ ہوا ہے۔ بعد میں مختلف روایتوں کے ساتھ مشہور ہوا۔ میں اور ابن الشاء بیڈن روڈ پر سے گزر رہے تھے۔ راتل پارک سے بیڈن روڈ کی طرف جاتے ہوئے بائیں ہاتھ کو ایک جوڑوں کی شاندار دکان آتی ہے۔ دکان کے شوکیں میں جوتے بچے جوتے۔ نیچے قیمت کی چٹ منگی ہوتی تھی۔ ہم جوتے دیکھنے کھڑے ہو گئے۔ ایک بوٹ ابن الشاء کو پسند آگیا۔ چٹ پر بوٹ کی قیمت آکیں روپے کھسی تھی۔

ابن الشاء کہنے لگے۔

”یہ بوٹ امروز کے تین کالوں میں آئے گا۔“

لاہور میں پہلی وومنزل بس روٹ ہنریک پریٹلی۔ یہ بس کمرشنگر کے شاہ سے چل کر مال روڈ پر سے گزر کر سیدھی لاہور چھاؤنی کو جاتی تھی۔ میں اور ابن الشاء اکثر اس بس کی سیر کیا کرتے۔ ہم کافی ہاؤس کے شاہ سے بس پکڑتے اور لاہور چھاؤنی جا کر اترتے۔ بس میں ریش بالکل نہیں ہوتا تھا۔ گرمیوں میں ٹھنڈی ہوا کھاتے۔ بس شاہ پر لیں دکتی تو ہم درخت کی ٹہنیوں کو پکڑنے کی کوشش کرتے، کبھی اگلی بیٹوں پر جا کر بیٹھ جاتے۔ کبھی دائیں بائیں بیٹھ کر مال روڈ کے سبز دروازے کی سیر کرتے۔ بس لارنس باغ کے پہلو سے گزرتی تو دھوپ میں چمکنے سبز زراہ گھنے سرسبز درخت اور پھولوں کے تختے دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ چھاؤنی کے شاہ پر آ کر کہ ہم تو بس خانہ بازار کو مل جاتے۔ کبھی چھوٹے سے چائے خانے کے باہر ٹوٹی چھوٹی کرسیوں پر بیٹھ کر چائے پیتے۔ محلے جھل کی سیر کرتے اور پھر وومنزل بس پر بیٹھ کر مرنے کو تے واپس آ جاتے۔

ایک روز ہر سات کے موسم میں آسمان پر کالے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے، خوشگوار ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میں صری شاہ سے نکل کر ابن الشاء کے گھر کی طرف آ رہا تھا۔ داکل پارک کے قریب پہنچا تو ایک دم بارش شروع ہو گئی۔ ابن الشاء کے چینی بیگنوں نے ٹمک پینچے پینچے بارش میں جھلک گیا۔ برآمدے میں

کھڑے ہو کر ابن انشاء کو آواز دی۔ سردار محمود باہر آیا۔

”ارے آپ تو بھیج گئے۔“

اتنے میں ابن انشاء بھی باہر آگیا۔ میں نے کہا۔

”یاد چلو دو منزلہ بس کی سیر کرتے ہیں۔“

ابن انشاء نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا اور بولا۔

”معلوم ہوتا ہے تم دو منزلہ بس کی چھت پر بیٹھ کر آتے ہو۔ پہلے

چائے پیتے ہیں۔ پھر چلیں گے۔“

برآمدے میں بیٹھ کر ہم نے چائے پی اور باتیں کرتے رہے۔ اتنے میں بارش

عظم گئی اور ہم اجنبی ہال کی جانب سے نکل کر بیچرنگ کراس والے بس سٹاپ پر

آگئے۔ یہاں سے ہر ایک دو منزلہ بس پکڑی اور اس میں بیٹھ کر چھانوٹی پہنچ گئے۔

ہلکی ہلکی بوند باندی اور برسات کی ٹھنڈی ہوا میں ہم نے سیر کا خوب لطف اٹھایا۔

قوپ خانہ بازار میں چائے بھی پی۔ واپسی پر ہم پاک فی ہاؤس اتر پڑے۔ پاک

فی ہاؤس میں ہمارے کئی ایک دوست محفل جاتے بیٹھے تھے۔ ہم بھی اس محفل

میں شامل ہو گئے۔

ان ہی دنوں کیفی اعظمی بھی لاہور آگیا۔ خوبصورت آنکھوں اور لمبے بالوں

والا نوجوان۔ پاک فی ہاؤس اور پراڈائیز ریسٹورنٹ میں اس کے اشعار بھی

گرجنے لگے لیکن وہ چند ہی روز لاہور میں قیام کرنے کے بعد یہی روانہ ہو گیا۔ اس

کے جانے کے بعد ساحر حیدر نے بھی بمبئی کے لیے پر توڑے شروں کو دیکھتے۔ ہم

اُسے بہت بھجایا کرتے کہ بمبئی جا کر کیا کرو گے۔ لاہور تمہارے لیے بڑا موزوں رہے گا،

لیکن ساحر حیدر کوئی کی قسمت اچھی تھی کہ اس نے ہماری نصیحتوں پر عمل نہ کیا اور

بمبئی چلا گیا۔ ساحر حیدر کوئی کے پاس گرجنے کے رنگ کا ایکسائڈ اور کوٹ جوتا تھا۔

جسے میں ساحر اور احمد راہی باری باری پہنا کرتے تھے۔ اتفاق سے میرے پاس

ایک تصویر بھی رہ گئی ہے جس میں میں، احمد راہی اور عارف مہدائیس کھڑے ہیں۔

میں نے ساحر کا اور کوٹ پہن رکھا ہے۔ اُس روز اور کوٹ پہننے کی میری باری تھی۔

ایک بار ساحر کو اس کوٹ میں دیکھ کر ابن انشاء نے کہا تھا۔

”مجھے تو یہ تو گول کا اور کوٹ معلوم جیتا ہے۔ مزور یہ ماسکو سے لڑنے

بازار میں آیا ہو گا۔“

انجمن ترقی پسند مصنفین کے اجلاس میں ایک شاعر نے غزل پڑھی اس کے

ایک شعر کا مصرعہ یوں تھا۔

پھٹوؤں پہ انہماک سے شبنم گرا میں گئے

حاضرین میں سے کسی نے کہا کہ پھٹوؤں پہ انہماک سے شبنم گرانے کی بات

مجھ میں نہیں آتی۔ ابن انشاء نے کہا۔

”بات بالکل صاف ہے۔ شاعر صاحب پھٹوؤں پر ٹھکے ہوئے ہیں۔ ڈر اپر

ہاتھ میں لیے بڑے انہماک سے اس پر قطرہ قطرہ گوارہ رہے ہیں۔“

گو لٹری ڈنڈہ دلالان امرتسر کا گڑھ ہے۔ ہجرت کے بعد ہمارے محلے کے تقریباً

اوسے لوگ، دوست اور رشتے دار گو لٹری میں آکر آباد ہو گئے تھے، چنانچہ میں اکثر

ابن انشاء کو قتلے ہو کر گو لٹری میں اپنے دوستوں کے پاس آ جاتا۔ ہماری مجلس،

شیراز ہوش اور پنجاب سلم ہوش اور شیرازی ہوش میں لگا کرتی۔ ان محفلوں کی ذمیت

پاک فی ہاؤس اور میرا دفتر ریسٹورنٹ کی محفلوں سے بالکل الگ تھی۔ عموماً نانا کی

کے نور کی پھیلی کھڑکی کی فضا سخت سردیوں میں خوب گرم ہوتی۔ اس کی ایک

چھوٹی سی کھڑکی دوسری جانب ایک تنگ دکان کی گلی میں کھتی تھی۔ جہاں چوری

پہچے چرس وغیرہ بکا کرتی تھی۔ ادھر سے گھوڑوں کے اصطل کی بوا آیا کرتی۔ اس

کوٹھڑی میں بیٹھ کر کچھ لوگ چرس بھی بیا کرتے تھے۔ سردیوں میں جب کوٹھڑی

کی فضا چرس کے دھوئیں سے بوھل ہو جاتی تو کھڑکی کھول دی جاتی۔ چھت پر

گئے در دیب کی روشنی میں مجھے کچھ لوگوں کی سرٹ آنکھیں جھٹوؤں کی طرح چلتی

نظر آ کر تیں۔

صوفی نے بڑی سختی سے رخ کر رکھا تھا کہ خبردار کوٹھڑی میں کوئی چرس نہ پئے
لیکن لٹا تھا بھلا کھڑکی کے باہر نہ نکال کر زور نہ دے کش لگاتا اور پھر لڑائی کی بجائے
کہ چور تھے پر بیٹھ جاتا۔ یہی حال سبھی لہرو کا تھا۔ وہ نکلے مرست کرتا
تھا اور اس ترملے کی شہسوڑ نظم ایک دو تیس فی کا عاشق زار تھا۔ کسی وقت ترنگ میں
اگر صوفی کے کندھے پر پانا ہاتھ رکھ کر کہتا۔

”یار صوفی! کسی طرح تم میں قی کو یہاں اپنے ہومل میں نہیں بولا سکتے؟“
خواجہ اشقام فروش بروقت امرتسر کی باتیں کیا کرتے تھے کسی وقت اچانک
خاموش ہو جاتے جیسے کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے ہوں۔ پھر اچانک تھوٹتی
کو زور سے ہلکے آنکھیں چھپکتے اور کہتے۔
”یار! امرتسر میں جگنو بیٹے ہو ا کرتے تھے۔“

جاو اور فرور بڑی خوشی طبیعت والا تھا۔ اس کے ماتھے پر زخم کا لمبا نشان
تھا۔ ایک روز اندر آکر ہاتھ کٹھا کٹھا کر خیالی تلواریں چلانے لگا۔ حاجی ابو بکر نے فریاد
پہلوان کیا کہ رعبہ جو؟“

جاو ابولا۔

حاجی حبیب! بس یہی دل چاہتا ہے کہ اسی طرح گھما گھمچ تلواریں چلاتا
دشمن کے لشکر میں گھس جاؤں۔“

اسد گجر صوفی کے تنور پر بیٹھ لگتا تھا۔ صبح کے وقت وہ مشین کی طرح پیچوں
پر تپ جاتا تھا کہ توڑ میں لگتے جاتا اور شام کو تنور پر بیٹھ کر سونے شیراز ہومل کے
باورچی سے فحش مذاق کیا کرتا۔

ایک روز صوفی نے اُسے کہا۔

”اسد! کبھی خدا کا نام مجھ سے لیا کرو۔“

اسد گجر نے سر پر ہاتھ پیر کر کہا۔

صوفی صاحب! امرتسر کی مسجد خروین میں ساری نمازیں پڑھتا تھا۔“

بلا دھونی شراب کا رسیا تھا۔ شیراز ہومل میں آکر سب دوستوں سے صاف
صاف کہہ دیا کرتا۔

”خبردار جو کسی نے مجھے ادھار دیا۔ خدا کی قسم سب کی شراب پی جائے گا اور
ایک باقی واپس نہیں کروں گا۔“

حکیم موثر شاہ سوتے اور مہر الرحمان امرتسر کی دکان سے چھ آدمیوں کا
ہریسہ اکیلے کھا جاتے تھے۔ وہ کھا کر اٹھتے تو ایک تلواریں ہاتھ میں ہوتا ہے وہ توڑ
توڑ کر کھاتے ہوتے اپنی دکان پر آکر بیٹھ جاتے۔ وہ بے کو شراب نوشی سے اکثر
منع کرتے۔ ایک دن ہا بل اٹھا۔

”حکیم صاحب! میں نے کبھی تمہیں منع کیا ہے کہ تم ہریسہ کیوں کھاتے ہو؟“

ابن انشاء ان لوگوں سے مل کر بڑا غصہ ہوا۔ کہنے لگا۔

”مجھے گوری کے گرد یاد آگئے ہیں۔“

ایک روز میں اور ابن انشاء شیراز ہومل کے باہر کر سبیل پر بیٹھ جاتے پی
رہے تھے۔ شام کا وقت تھا۔ موسم گرمیوں کا تھا۔ کچھ دیر بعد سائے مکان کی چھتوں
کے اوپر سے گول گول زرد چاند طلوع ہوا۔ ابن انشاء چاند کو دیکھ کر روماناٹک ہو گیا۔
الفاق ایسا ہوا کہ سائے والے مکان کی چھت پر گام قصابی ماش کروار تھا۔ ابن انشاء
اور میں ابھرتے چاند کو دیکھ رہے تھے کہ اتنے میں گام ماش کروا کر اٹھا۔ اُس نے
چاند کی طرف منہ کر کے دھوئی کھولی کر غیب اچھی طرح سے جھاڑ کر پھر ہاتھ میں اور پیچے
حکیم کو آواز دی۔

”حکیم صاحب! سردانی اوپر پہنچ دو۔“

ابن انشاء کا سارا روماناٹک تھا۔ سبز تباہ ہو گیا۔ ہنستے ہوئے بولا۔

”میں نے جو دیکھا ہے اُسے چھوڑو مگر چاند نے جی زندگی میں ایسا منظر کبھی
نہ دیکھا ہوگا۔“

شیراز ہومل میں کبھی کبھی امرتسر کے کچھ بھائی شاعر اپنا تازہ کلام بتا کرتے۔

اللہ دیکھا جانی کا بڑا اچھا شاعر تھا اور محبت جملہ کرنا تھا۔ وہ کوراہن پر تھا۔ اس کا گھر وہیں احاطے میں تھا۔ دوسری منزل کے ایک کمرے میں اکیلا رہتا تھا۔ ایک روز میں اور ابن انشاء اُسے ملے گئے تو دیکھا کہ اوپر کھڑکی میں بیٹھا بیٹے کپڑوں پر بیاہ نشان لگا رہا ہے۔ میں نے کہا۔

”استاد محبت مکان کی سیڑھیاں کدھریں؟“

اور پے پے ہنس کر بولا۔

”اس مکان کی سیڑھیاں نہیں ہیں۔“

واقعی اس مکان کی سیڑھیاں نہیں تھیں۔ محبت نے دوسروں میں بانس کے چھوٹے چھوٹے ٹھوسے بانسہ کو ایک کندھا ٹپ کی سیڑھی بنا رکھی تھی۔ اُسے نیچے شکار کرتا تھا۔ اس کے بعد اس کا پتہ میرجی اوپر کھینچ لیتا تھا۔ ابن انشاء بڑا ہنسنا کہنے لگا۔

”استاد ہی آپ پنجابی غلوں کے ٹارزن ہیں۔“

بکرا دوست تذکرہ بڑا اچھا لکھتا تھا۔ بڑے سُر میں تھا اور آواز میں غضب کا سوز تھا۔ اُسے جگر کا کلام پورے کا پورا یاد تھا۔ جگر مراد آبادی کا عاشق تھا۔ پنجاب سلم جوش میں رات کو کسی وقت سب چلنے کا دور چلتا تو تیز جگر کی یہ منزل بڑے دلنشیں انداز میں سنایا کرتا ہے۔

وہ یوں دل سے گزرتے ہیں کہ آہٹ تک نہیں ہوتی

وہ یوں آواز دیتے ہیں کہ پہچانی نہیں جاتی

ابن انشاء نے ایک بار اُسے کچھ شعر کہہ کر دیئے جو اُس نے بڑے پرسوز انداز میں لکھتے۔ اب وہ شعر مجھے یاد نہیں رہے۔ ضرور وہ ابن انشاء کے اپنے شعر ہوں گے، کیونکہ ابن انشاء کو دوسرے شاعروں کے اشعار بہت کم یاد ہوتے تھے۔ اگرچہ گولانڈی میں ابن انشاء بہت کم آیا مگر اس زمانے کی یادیں۔ فخر مگر خوشگوار یادیں آج بھی میرے دل میں محفوظ ہیں۔

وانا صاحب کے عرس کے موقع پر بھائی کے باہر تقریروں اور سرکس کینوں کی بڑی رونق ہو کر تھی۔ اگرچہ یہ رونق آج بھی اُسی طرح قائم ہے لیکن وہ دوست بچھڑ گئے جن کے ساتھ میں یہ رونقیں دیکھنے جایا کرتا تھا۔ ابن انشاء کو اس قسم کے تقریر دیکھنے کا بے حد شوق تھا۔ ہم دونوں بھائی گیت کی طرف تکی آتے اور ایک ایک آئے کا ٹھٹھ لے کر کسی دکانی سیڑھی میں داخل ہو جاتے۔ زمین پر مدیاں بھی ہیں سیڑج پر بیٹھا ہوا پرانی دقیا لوسی سیزری والا پردہ مگرا ہوا ہے۔ بانس کے ساتھ دائیں بائیں میس مل رہے ہیں۔ نیچے تخت پر ہارمونیم اور پیٹے والا بیٹھا ہے۔ لوگ شور مچا رہے ہیں سیڑیاں بج رہے ہیں۔ کھیل بیل بھول کا ہے۔ ہم بھی درمی پر جا کر بیٹھ گئے ہیں۔ اس زمانے میں بڑے ہی لوگوں کا پاٹ ادا کیا کرتے تھے۔ اتنے میں ایک آدمی سیڑج پر آکر دونوں ہاتھ اٹھا کر کہتا ہے۔

د خاموش سا تان (صاحبان) خاموش! ڈرامہ شروع ہونے والا

ہے۔ اپنی اپنی جیبوں سے جوشیار رہیں۔

اتنے میں پردہ اٹھا۔ لیکن پھر گر گیا۔ شاید رسمی ڈٹ گئی تھی۔ لوگوں نے گالیاں دینا شروع کر دیں۔ پردہ دوبارہ اٹھا اور سیلیاں یعنی بڑے ٹھوٹوں کے لباس میں منہ پر سہمی پاؤڈر بھرتے دیکھ لگتے کورس لگاتے گئے پھر بیل بھول کا کھیل شروع ہو گیا۔

ایک ایک مکملے پر ہیں اور ابن انشاء ہنسی سے لوٹ لوٹ ہو رہے تھے۔

ابن انشاء ساتھ ساتھ فقرے چست کر رہا تھا۔ جو روکا سلی کا پارٹ ادا کر رہا تھا۔ اتفاق سے اس دور اس نے تازہ قمارہ سر منڈوایا تھا اور وہ لگا رکھی تھی سفر یہ تھا کہ بیل ڈرامہ بالکونی میں کھڑی بیٹھے کونڑے بھول سے محبت کے مکالمے بول رہی ہے۔ پھر اُس نے جوش محبت سے جو نیچے بھول کی باہنوں میں چھلانگ لگائی تو اس کی دھک اوپر کسی کیل سے الگ کر دیں رہ گئی۔ بھول کی باہنوں میں

جو لیل گری یا اگر اس کی منڈ چمک رہی تھی۔ جنوں نے ماضی کی طرف دیکھ کر
موت پر سکھارہ بولا۔

”یا اللہ! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ یہ لیل ہے کہ حلوہ کدو؟“

ایک دم پردہ گرا دیا گیا اور پہلی دوبارہ وگ فٹ کروا کر سننے آگئی اور جھک
جھک کر دو گوں کو سلام کرنے لگی۔ پھر کمرہ پر ہاتھ رکھ کر ٹھٹھک ٹھٹھک مچانے لگی۔

”کوئی پتھر سے زمانے میرے دیوانے کو“

کھیل کے افتتاح پر ایسا ہوا کہ اچانک سٹیج کے دونوں گیس جلتے جلتے بجھ کر
اود بکھ گئے۔ اس زمانے میں اکثر لوگ ٹارپوں ساتھ کے کرختیڑوں اور سینا
گھروں میں جا با کرتے تھے۔ عفو دمی دیر بعد جو حاضرین نے مارتھ کی روشنی چھٹی
نوکیا دیکھتے ہیں کہ سٹیج پر پہلی اور بیٹوں نے ایک ایک کبلیں کا ہنڈا پاؤں میں
دوبل رکھا ہے اور دھڑا دھڑا اس میں جوا بھر رہے ہیں۔

سز کے تیرے روز میں اور ابن الشاء ٹھکانی کے دروازے کی جانب بھی شاہ
مختیڑ میں گئے۔ وہاں سوینی مینوئل کھیل ہو رہا تھا۔ مینوئل کوئی بٹالہ پہلوان
بنا ہوا تھا جس نے کلائی میں گھڑی یا مدھر رکھی تھی۔ مینوئل بڑے جذباتی انداز
میں اپنی محبوبہ سوینی سے ڈانٹا لگ بول رہا تھا کہ کابل والے کے ٹونڈے سے
سٹیج کے آگے سے گزرتے ہوئے مینوئل کی طرف دیکھ کر کہا۔

”پہلوان جی! شو ختم ہونے کے بعد کتنے کباب لاؤں؟“

مینوئل نے مکانے چھوڑ کر ٹونڈے کی طرف منہ کر کے غصے میں کہا۔

”بک بک بند کرواؤں کھوتے دیا پتڑا۔“

ابن الشاء بہت ہنسا۔ کہنے لگا۔

”بڑی اچھی بات ہے کہ یہ لوگ ڈرامہ بھی بولے جاتے ہیں اور آپس

میں باتیں بھی کرتے جاتے ہیں۔“

ایک بار بلی گیٹ والے کسی مختیڑ میں شرین فریاد کھیل ہو رہا تھا۔ اس

قسم کے مختیڑوں میں جو پردہ اوپر سے لگا کر تھکا وہ کٹڑی کی ایک وزنی گیل سے بندھا
ہوتا تھا۔ اسے کھینچتے پردہ اوپر سے کھلتا ہوا دھڑام سے سٹیج پر آکر گر پڑا تھا۔
یعنی کھل جاتا تھا۔ کھیل شرین فریاد کا آخری سین یہ تھا کہ شرین کی موت کی خبر سن
کر فریاد سر پر کھانڈا مار کر گرتا ہے اور جاتا ہے۔ دن میں دو تین شو اس کھیل
کے ہوتے تھے۔ ہر بار فریاد مکر سٹیج پر گرتا تھا۔ اوتالیوں کی گونج میں پردہ اوپر
سے ایک دم گر پڑتا تھا۔ فریاد نے سٹیج پر ایک خاص جگہ مقرر کر رکھی تھی جہاں اُسے
گرتا ہوتا تھا تاکہ اوپر سے آؤ والی وزنی گیل سے وہ محفوظ رہے۔ ایک بار ایسا لگا
ہوا کہ حساب غلط ہو گیا۔ فریاد کھانڈا مار کر سٹیج پر گر پڑا۔ لوگوں نے زور زور سے
تالیاں بجائیں۔ فریاد کی خوش قسمتی تھی کہ مین وقت پر اُس نے جوا ایک آنکھ کھول
کر اوپر دیکھا تو اس کی جان ہوا ہو گئی۔ کیونکہ وہ اوپر سے گرنے والی وزنی گیلی
کی زد میں تھا۔

اب لوگوں نے دیکھا کہ سٹیج پر پڑی ہوئی فریاد کی لاش ایک دم سے بجلی کی مانند
اٹھی اور فریاد پر سے جا کر پھر دھڑام سے گر پڑی اور بے حس و حرکت ہو گئی۔ لوگ دہخو
ہی سننے کے پردہ گر پڑا۔

دانا گج قس قس اللہ علیہ کا سر اس اب بھی آتا ہے۔ جہاں گیٹ کے باہر سیل
بھی لگتا ہے۔ مگر جس میں سوینی موت کے ساتھ میں اس سیلے کی سیر کیا کرتا تھا گوہ
کین نظر نہیں آتی۔ وہ تو اس سیلے میں کہیں پھونک لگی اور پھر قس قس الیوں کہ پھر کبھی لگات
نہ ہوتی۔

ہم کسی در پہ نہ ٹھہرے، نہ کہیں دستک دی
یہ نیکوئیوں درختے مری جاں ترے در سے پہلے

چاند سے آنکھ ملی، جی کا آجالا جاگا
ہم کو سوار ہوتی صبح، سحر سے پہلے

میں نے بیت میں کر کہا۔

چونکہ میرا شعر کا غاد خالی ہے اس لیے میں تمہیں داؤ نہیں دے سکتا،

لیکن یہ جس کے بھی شعر میں بہت اچھے ہیں۔

ان دنوں مال پر چیرنگ کر اس کے پاس "لور نیگلز" نام کا ایک ریستوران
ہوا کرتا تھا۔ ویسے تو بصورتِ خوشبودار چاہتے اور پرسکون صاف ستھرا ماحول
پھر کسی ریستوران کو ملا۔ یہاں مشہور صحافی حمید نظامی بھی اپنے احباب کے
ساتھ بیٹھا کرتے تھے۔ تاہم جی کی گول میز میں بھی یوکلےس کی شائیں، چھت سے
ایٹس ٹرسے — کوسٹریبلے گلدازوں میں بھی یوکلےس کی شائیں، چھت سے
فرش تک نعل کے پردے اور اعلیٰ ترین چاہنے کی ہلکی ملکی خوشبو — دُور دُور
بیٹھے ہوئے چند ایک کم سخن سکون پسند لوگ — بڑا انفرادی ماحول تھا۔ اس
ریستوران کا۔ امین انشاء کو بھی "لور نیگلز" کی پرسکون روحانی فضا بہت پسند تھی۔
کبھی کبھی ہم یہاں بھی چائے پینے آیا کرتے تھے۔ "لور نیگلز" کی فضا میں اگر ان انشاء
بھی بہت روحانک ہو جا کر مانتا تھا۔ کوسٹریبلے میں بسے بیٹھے گلدازوں اور دیواروں
سے لگے کاسٹی کے عشق عقائد کو دیکھ کر وہ بے اختیار کہہ اٹھتا۔

"یہاں بیٹھ کر ایک بار پھر علم جو شراب بھی مل سکتی ہے۔"

شاہد اس فضا کا اثر تھا کہ اُس نے پہلی بار اپنی طویل کلاسیکی نظم "افدا ایک
رات" لکھی اسی ریستوران میں سنا۔ وہ دن اپنی تمام تر خوشبودوں، رنگوں اور خوب
نقشوں کے ساتھ مجھے آج بھی یاد ہے۔ شاہد مجھری کا شروع یا د میر کا اخیر تھا۔

امین انشاء نے اپنی اپنے شعر بیت کہ سناتا تھا۔

اکثر اپنی کتاب یا کوئی کھول کر شعر سنایا کرتا۔ ایک روز مجھے یاد ہے بڑی
بارش ہو رہی تھی۔ میں اُس کے چینی بیگروٹے یعنی ایٹس روڈ والے مکان کے
برآمدے میں اس کے پاس بیٹھا تھا۔ برسات کا موسم تھا۔ بڑی عمدہ چائے ہم نے
دہے تھے اور ایٹس روڈ پر سے بھیگتے لوگوں اور تانگوں کو گزرتا دیکھ رہے تھے
اور باتیں بھی کر رہے تھے۔ یہ ۱۹۶۹ء کی برسات تھی۔ امین انشاء نے اچانک
اٹھتے ہوئے کہا۔

"ٹھہرو۔ میں تمہیں کچھ بیت سناتا ہوں۔ تازہ کھچے ہیں۔"

پھر وہ اندر گیا اور ایک کاپی اٹھالیا۔ کچھ دیر اُس کی ورق گردانی کرتے
کے بعد ایک کاغذ نکالا۔ کاپی بدل کر کے چٹائی پر رکھی اور بولا۔
"اگر چہ تمہارا شعر کا غاد خالی ہے، پھر بھی ذرا غور سے سننا۔"

اس نے عین بیت سناتے جہل میں اس کے شعری مجموعے "چاند نگار" میں

بھی چھپے۔ یہ تینوں بیت مجھے آج بھی یاد ہیں۔

جی بہتا جی نہیں ہے کوئی صاف کوئی مل

راتِ مصلحتی جی نہیں چار پہرے پہلے

لاہور کا آسمان ابراؤد تھا اور ماں پر ہلکی ہلکی دھند چھائی ہوئی تھی۔ ہم لوہنگیزہ کی نیم گرم پڑ سکون فضا میں بیٹھے خوشبودار چائے پی رہے تھے اور خدا جانے کس موضوع پر باتیں کر رہے تھے۔ ابن انشاء نے ڈیڈ کا بیک کوٹ پہن رکھا تھا۔ گرے پتلون تھی اور گنگے میں مغر بھی تھا۔ باوقار ہیرے پر نیچیدگی تھی۔ اُس نے حیب سے کاغذ نکال کر میز پر رکھے اور اپنی بینک صاف کرتے ہوئے بولا۔
 ”میری نظم سنو، لہذا کی ایک رات“
 ”مزور سننا“۔

ابن انشاء بہت کم کسی کو شعر سنایا کرتا تھا۔ مجھے وہ یہ نظم شاید اس لیے سنانا چاہتا تھا کہ میں بھی لہذا کی راتوں کا مسافر تھا۔ بیک چڑھا کر وہ کچھ دیر کاغذوں کو الٹ پلٹ کر بھیک کرتا رہا۔

”ہیں میری اس نظم میں ظلم ہوش رہا بھی ملے گا۔ شہزاد کی راتیں بھی میں گی اور جد کے کن رے شفقت کرتے ماہی گیروں کی گیت بھی سنائی دیں گے“

”لہذا کی ایک رات“ ایک ایسی طویل نظم ہے جو ابن انشاء کو بہت پسند تھی۔ اس نظم میں ابن انشاء کی روان پسندی، اسراریت اور حقیقت بینی میں پورے شروع پر دکھائی دیتی ہے۔ مجھے یہ نظم ان دفتروں بھی اپنی طلسمی فضا کی وجہ سے پسند تھی اور آج بھی اسی وجہ سے پسند ہے۔ میں نے مزید چائے منگوائی۔ ایک سیالی اپنے لیے اور ایک ابن انشاء کے لیے بنائی۔ ابن انشاء نے چائے کے دو ایک گھونٹ پئے۔ میں نے کرپون اے کا سگریٹ سٹکا لیا۔

”اب شروع کرو۔“

”اور ابن انشاء نے بڑی پرسکون دھیمی آواز میں نظم سنائی شروع کر دی۔“

سندباد آج تو مہوا دھبے بھی سے چل

دل جو بہلا تو اسفلوں ہی میں اپنا بہلا

میں ترے ساتھ زمانے کی نفیسے اور جھیل
 لے کے چلتا ہوں خیالوں کا سفیر اپنا
 جا ہی نکلیں گے کسی شہر میں ہم آج کل

شور و غل شہر کا مدغم ہوا، پھر ڈوب گیا
 آج بستی سے بہت دور نکل آیا ہوں
 غلگت شام نے دھندلا دیے دشت و دریا
 سوچتا ہوں کہ سرائے کو ابھی لوٹ چلوں
 یا اسی ساعت ویراں کے کسی گوشے میں
 سرد باغ کو بنائے ہوئے بستر اپنا
 آج کی رات گزاروں کہیں بیٹھے بیٹھے
 شہر و صحرا میں مسافر کے لیے فرق ہی کیا؟

غواب آلودہ ہے جد کے سوا کا جہاں
 پھینے جاتے ہیں پراسرار دھندلے پرچو
 خشکیاں وصعت صحرا میں ہوئیں بال فشان
 موندھی سوندھی سی رآتی ہے کہاں سے خوشبو
 سطح جسد پر گزرتی عیسے کوئی
 شام کی دھند میں لپٹا ہوا ہوئے ہوئے
 شہر کی سمت بڑھا جاتا ہے نیک چپ چاپ
 جیسے خاموشی صحرا سے اُٹھنے سے ڈرے

ہرے ساحل پہ پھیروں کی کسی بجی میں
جاگتے جاتے ہیں مٹی کے تنک تاب دیتے
کوئی دم جاگ کے تنک جاتیں گے سو جائیں گے
کون اس رات کو پایاں سحر تک پہنچائے

زرد بڑو چاند تھکے ہارے سناڑ کی طسرح
منزل دور کی راہوں کے قشور سے اداس
مطلع شرقی سے ابھرا ہے پریشاں حیراں
دشت ویراں میں کجیروں کے کسی قبضہ کے پاس

اور کسی مرتد بھکت کے گنبد میں کہیں
دویش و اہرز کی گردش کا تپا ہوا بوم
آلی برک بنی مٹاکس کے نوے صا ۳
کیوں دیک جاتا ہے کیا رنگی کس کو معلوم

اک عجب کیفیت خواب مسلط ہے یہاں
شور ماتم ہے کسی سمت نہ شادی کا غروش
اپنی دنیا کے کش کش کو میسر ہیں کہاں
خٹکی شام میں بیٹھے ہوئے لمباست غروش

وہ شقت میں کیں۔ راتیں سانسے گھٹتے
صبحیں آئیں چلتا تازہ کے سندیلے سے کہ
روح بے مہری اوقات کا محور بنا جائے

جائے کب تک ہے یہی سلسلہ شام و سحر

شاہزادوں ہی کی جاگیر میں سارے انعام
اپنی تمت ہے فقط غار کشی۔ محسرومی
کچھ اسی دور میں دیکھا ہے یہ رنگ آیام
زندگی پہلے زمانوں میں تو دوشوار نہ تھی

ہاتے کیا دل تھے۔ میسر تھا ہر انسان کو فراخ
پہچم قدرت کی منایت پہ جیا کرتے تھے
سب کی پیوں میں ہو کر تھے جادو کے چراغ
جن بھی کام سر انجام دیا کرتے تھے

حکم ملتے ہی بنا دیتے تھے بگڑی ہوئی بات
میشیں جاوید میں آنے نہیں پاتا تھا فصل
لاکے پہلو میں پچھا دیتے تھے محبوب کی سیج
رات کی رات میں چن دیتے تھے مر مر کے حل

خضر و ایاس غلاؤں سے ٹپک پڑتے تھے
آیا کرتا تھا کڑا وقت کسی ہر جو کبھی
جی میں آئی تو ہوتے دیدہ حیران سے الوپ
سحر کی شہر شمسرح پہ زمانے بھر کی

ہیٹ بھوکا تھا کوئی اور نہ بڑبڑہ کوئی جسم

کس کو مزدوری و محنت کی پریشانی تھی
قاضی ایں ہمہ حاجات تھا سم سم کا علم
باد آورد خستہ آلود کی فسادانی تھی

ہم نے دیکھا ہے پھروں نے جو ڈالا کبھی ہال
دجلہ سے عہد سلیمان کے خزینے نکلے
اپنی تقدیر پہ کو راز بھروسے کے طفیل
کہتے جبال سر بام امارت پہ نیچے

دیکھتے دیکھتے افلاکس لکڑیوں کا
شوکت و شان وزارت میں بدل جاتا تھا
اسم اعظم کی کرامت تھی جہاں گھر ایسی
سایہ ادبار کا اک آن میں مل جاتا تھا

شہر میں آئے گم سہروں جو مسافر کوئی
لوگ اُسے شہر کا سلطان بنالیتے تھے
تاج رکھتے تھے سرفروغ لہو و نیاز
اپنا آقا بہ دل و جان بنالیتے تھے
بادشاہ زادیاں قدموں میں پچھی رہتی تھیں
دور از دست نہ تھے قاف کی حرول کے پرے
اپنے محلوں میں پھیلائی تھیں لاکر پردیاں
اپنی آدم جو اکیسے میں کہیں مل جاتے

اپنا یہ عالم ہے رنگ بھی عالم ہے کوئی
آؤ کچھ دیر انہی خوابوں کے جزیروں میں چلیں
ڈھونڈیں بند او کہن سال کی گلیوں میں سکیں
ارضی افسانہ پہ جاؤ گے کھٹوے میں اڑیں

کتنی شب بیت گئی دجلہ کی ساکن موجوں
آدمی بجتی ہے کہے پہلے پہر کا ہنگام
کشت انجم سے گزرتا ہوا مغرب کی طرف
منزلیں ملے کیے جاتا ہے میر سست غرام

چادر خواب میں پٹا ہے جہان موجود
الف لیلہ کے فنانوں کا جہاں ہے آباد
شہرِ رمان کے منگاموں کا عالم ہے وہی
پھر وہی شور و غلاق ہے بسوق و بازار

پھر انہی رندوں کے فیض میں خوابات کے گرد
کہنہ جہروں میں کھکتے ہیں وہی جام و سبزو
قصر شامی کے عہد و کون میں پریشانیں اٹھ
ماہ رخسار کینزوں کے گھنیرے گیسو

شور و غبر ہے زبیدہ کے شہستان میں بلند
دود و غبر کا قطر ہے فضا میں ساری
ٹوٹے اجواڑوں میں پائل کے چھناکے گوبے

چم چھا چم - چھا چم - دھس ہوا ہے بھاری

لو کوئی عزیز نہ ہو سدا قیامت بدروش
اپنا سدا پیہ اجما زیمٹے آئی
(سانہ بیدار ہوئے - جھانجھنے پہلو بدلے)
اور مفتی نے سنا دل دیمے سڑوں میں چھوڑی

اے دل اندیشہ آلام نہ کر آج کی رات
ان کے چٹوں کے اشارے ہیں ادھر آج کی رات

دیکھتا ہے شبِ عشرت کی نہایت کیا ہے
برہم افش ہے کہ ہوتی ہے حسد آج کی رات

ایسے عالم میں قیامت کا نہ چھوڑو مذکور
قدوایان بچتے ہیں، مگر آج کی رات

زاہد و جام و مجر و شکر کی صورت چھوڑو
ساتیوان پہ بھی اس کی نظر آج کی رات

دل کو برماؤ ستاروں پہ کندیں ڈالو
رقصِ مسرہاؤ بانداؤ و گر آج کی رات

ٹنگ جی گیت کی لئے، مغم جی پائل کی چٹنگ

رقصِ پیماؤ وینا کی ہوئی تیار سی
اک طرف عزتی نے ناب ہوئے ظن اللہ
ماتہِ برش اُدھر ہار گئے درباری

اور ڈیوڑھی پہ کھڑا ایک غلام زنجی
اپنی دنیا سے تصور میں کہیں کھویا گھبرا
آہیں بھرنے لگا اڈے ہوئے آنسو روکے
بیٹھے بیٹھے اسے کیا جانے کیا یاد آیا

اس کے خوابوں کی سیر پہرہ بدی رہتی ہے
ارضِ تاریک جہش کی کس وادی میں کہیں
اُڑ کے جاتے اسے سینے سے لگا لے لیکن
آج اک جنسِ تمہارت ہے یہ انسان تو نہیں

یہ بھی دنیا ہے دُوی - آؤ کہیں اور چلیں
ہم تو آئے تھے اسی درد سے ڈرتے بچتے
سسکیاں گیت کی لئے ہیں لگو گھر ہیراں
گرم اشکوں میں شرابور ہیں رخصتا پہرے

کون بیٹھا ہے وہ دیکھیں تو سر راہ گزار
ہے اسی شہر کا بامی کو مسافر کوئی
اپنے دھڑے کو بھانے گی کوئی مہر نگار؟
کس کی رہ دیکھ رہا ہے ذرا بوجھیں تو بھی

بو آئیں نام کا اپنا یہ وہی دوست نہ ہو
آنکھوں میں تھا جو ہر شام سر راہ گزار
جھنجھول میں کسی اجنبی جہاں کی سیلے
اس کی یہ وضع معین تھی خزاں ہو کر بہار

بیس میں تاجر موصل کے خلیفہ باروں
ایک شب اُس کے شبتاں میں جو آکر بچھرا
کھا کے یک روزہ خلافت کا فریب سیں
یہ بچار کسی مجلس میں نظر آیا بخت

دیکھنا نعل النبی کی سواری آئی
رہستہ چھوڑ کر سلطان جہاں آتے ہیں
ساتھ لشکر ہے مذہبوں کا خزاں براہ
سر پہ طاووس و ہما سایہ کناں آتے ہیں

دھول مٹی میں سے کیڑ و کھڑو رستہ
ہندگی پیشہ غلاموں کے گروہ چٹ جاؤ
اپنی منوس جبینوں کو چھپا لو فوراً
شاہ دوراں کی نگاہوں سے پرے ہٹ جاؤ

دور وادی میں نظر آتی ہے اُونچے اُونچے
بہر پرلوں کے خلافت کی دھندلی سی قطار
اُوکھچھ ویر ویر چل کے ذراستائیں

کچھ تو رہو خاطر در ماندہ کو سامان قرار

شہرِ سمور نہ پڑتا ہو سگر رستے میں
جس کے بازار میں خاموش بہائم سے پٹے
ایک دن یہ سبھی انساں تھے مگو آج نہیں
کس میں بہت ہے کہ اس عمر گراں کو توڑے

کتے مہ پاروں کے جھڑپ میں حرم کی رونق
بچتے ہیں چاند سے جسموں پر مرثعہ گئے
جمع میں خدمتِ اقدس میں زاد کیا کیا
غللِ سبحانی کی شوکت کے تو پھر کیا کہنے

پیچ کس کی یہ سر بامِ نلک جا پہنچی
کون برسوں کی قنت سے پٹ کر دیا
پہلوئے شاہ میں کس کس کا ہنگر گوشہ ہے
کتنی گنتیاں آج سکر حرم آباد ہوا

دردِ فدا بیدہ کی ٹیسیں بھی تو جاگ اُٹھتی ہیں
عشرتِ روح کا سامان نظر آتا ہے جہاں
ایک کانا بھی تو چھو جاتا ہے چٹکے سے کہیں
پچھول بہت جگہاں نظر آتا ہے جہاں

شہرِ رومان پہ چھایا ہے وہی رنگِ طلائ

جس سے انسان کو مفر عالم امکان میں نہیں
سند باد آئے۔ مگر سخی طوفان کے ستارے
تسمہ پاؤں کی اسیری میں دل انگار و غنیں

کس کی فضل میں یہ لے آئی ہے اب کے افتاد
بزمِ باروں تو نہیں صاحبِ در سے پوچھیں
ہر کوئی اُنہ کے سنا ہے کہانی اپنی
بہم بھی اس حلقے میں چل کے ذرا بیٹھیں کچھیں

نخلِ سبحانی ترا مرتبہ قائم دائم
تجدد کو اللہ سلیکان کا نصب بخشنے
میں بھی اس شہر کے بازاروں میں نو وارد ہوں
میری باری ہے تو میری بھی حکایت سن لے

میں کسی شہر کا تاجر ہوں نہ والی نہ وزیر
نہ کسی شاہِ معاصر کا جگر گوشہ ہوں
نہ کسی بادشاہِ زاوی کی محبت کا اسیر
سر میں سودا سے نہ کچھ اور جنوں

میں وہ درخان تھا جو کھیتوں میں اگاتا ہے اناج
فصل پکنے پہ بھجتا ہے کر محنت بر آئی
یہ مگر حیرا کہیں تیرے پیادوں کا خراج
میں جو کھلیان سے دامن لیے اُٹھا خالی

آج مزدور ہوں اک تیل کے ٹل کا مزدور
اور اس جہدِ شب و روز سے پایا کیا ہے
خود تہید ست ہوں، خواجہ کے خزانے بھر پور
اب میں یہ پوچھنے آیا ہوں۔ یہ دنیا کیا ہے؟

کیا مجھے پدمچم کا وہ لٹے آنا ہوگا
کیا تمہیں ہوش میں آئے گی غلافتِ تیری
کیوں تری بزمِ ہوتی جاتی ہے و بزمِ بزمِ
نخلِ سبحانی مری بات تو سن لی ہوئی

نرم بالو کا بچونا ہے غنک اور مرطوب
چاند مغرب میں بہت دود کہیں جا پہنچا
سطحِ جہل پہ گڑھے نہ عید کوئی
نذر خواں بزمِ بھی مدت ہوئی خاموش ہوا

گشتیان بھی ہیں، گرد آؤں ہے، غور اُٹھتا ہے
کارواں موصل و شیراز کے آتے ہوں گے
مشہد و ہزد و صفایاں کے امیروں کے سفیر
تھکے ہر ملک کے ہر دیس کے لاتے ہوں گے

با ہلاکو کے عساکر کا عہدِ اول ہوگا
میں نے تخیلِ مہلک کے عوام سے کر
آج ہندو کے ایوانوں کو تاکا ہوگا !

اب کوئی دم میں ہوا جاتا ہے سب زیروزہ

کیا مگر اس سے بدل جائیں گے اپنے آیام؟
ہوں وہ مستحکم وہاروں کو ہلاکو کوئی
جب تک اس بیج پہ چلتا ہے زمانے کا نظام
کون کہتا ہے بدل سکتی ہے قسمت اپنی

کوئی موجود سی اس آس پر کب تک جی سے
بغیر وہ اب کوئی فرستادہ جنب آئے گا
اُنکے توڑے گا وہ انکسار کے علم کے نہیں
(پہچو ہمدی کی جملے وہ ہلاکو نکلا)

ابن آدم کا جہاں - درد ازل کا مبطل
قیدِ مہ سے کبھی آزاد بھی ہوگا کہ نہیں
حسرتیں دل میں پلے جائیں گی کب تک آخر
پر خرابہ کبھی آباد بھی ہوگا کہ نہیں؟

اب تو پوچھ بھی پٹی - نور کا تو کا بھی ہوا
اور میں اب تک یہیں بیٹھا ہوں یہ عالم کیا ہے؟
رات کے آخری تاروں کا دوبارہ خاموش
صبح تازہ کی ولادت کا پتا دیتا ہے

اور کبھی پاس کی بستی میں نوؤن کوئی

اہل ایماں کو ملتا ہے جماعت کے لیے
اس کی آواز کا یہ محسوس ترنم - یہ گماز
دل سے کہتا ہے یہاں سے نہ اٹھاؤ ڈیرے

دور اک ریل کے انجن کی پریشاں سیٹی
چچا اٹھی ہے کر تعطیل کے دن ختم ہوئے
آج ہی رخصت سزا باندھ کے جانا ہوگا
منظر بیٹھے ہیں کر کوک میں افسر میرے

پھر وہی سرفلک دود گشوں کی ڈسینا
پھر وہی تیل کے چٹوں کی فضا کے بودار
پھر وہی سلسلہ ہمدِ گراں ، مزدِ قلیل
اور وہی محل میں خراج کے طلا کے انبار

اور یہ خواہر کہیں الزبحی، اکبیں امری
جس کی صد رنگ سیاست کا ظہم حسین
تھرپاؤں کے ہے مٹری کی فضاؤں پر سوار
کب تک اس سحر کا معمول رہے گی یہ زمین

شہزادوں کے تھیل کا وہ بغداد کسلاں
نفت و روغن کی سیاست ہے فضاؤں میں رچی
بیس میں تیل کے تاجر کے نعل آتا ہے
اب بھی بغداد کی گلیوں میں خلیفہ کوئی

کوئی اس تاجر معصوم کے صلے دیکھے
صاحبِ خاں بنا جاتا ہے کل کا مہمان
چام کے دام چلاتے ہیں اجارے اس کے
نام باروں کا ہو، فیصل کا ہو زیب عنوان

اب بنارا و سمرقند کی راہوں سے کبھی
بہرِ یلغار نہ آئیں گے ہلاک کے مغول
آج کی دنیا ہے لارنس و گلب کی دنیا
آج تسخیرِ ممالک کے ہیں کچھ اور اصول

اوردے سام کا اونٹ سا اشارہ ہو اگر
قویں بک جاتی ہیں اور تخت الٹ جاتے ہیں
منظمتِ دہلی و ایٹھنہ تو انسان ہوئی
ہندو دیوتان اسی حاتم کا دیا کھاتے ہیں

بصرہ و موصل و بغداد ہیں اس کی جاگیر
روم و مصر اس کے ہیں نجد اس کا ہے شام لکھنے
اس کے سکتے طفیل ایک جہاں میں آشوب
آج بغداد کا باروں بھی مسلم اس کا ہے

حوت ڈال کی کراست ہے کچھ ایسی بلوان
حوت سم سم کا منوں گمزد ہوا جفتاب ہے
یکتہ دس گے میں بندھی آتی ہیں سرکار میں کبھی

تیل و حرّی کی ہر اک من سے کھینچا آتا ہے

سیلِ انوارِ محمد پھیل چلا ہر جانب
آخر شب کے دھند لوں کانوں بھی ٹوٹا
اب تو بہتر ہے کہ بیتی کی طرف لوٹ چلا
آج ہی رختِ سفر باندھ کے جانا جو ہوا

دل کے اُلجھے ہوتے احوال کو سلجھانے کے
شہرِ باروں کے یہ پڑھ چچ مستقف بازار
میں سرائے سے جو نکلا تو پھر اسوق لبوق
پھر بھی چھایا رہا دل پر وہی ہے نامِ بنار

قہوہ خانے میں جو پل بھر کے پیسے جا بیٹھیں
آنکھتا ہے اک آوارہ گداؤں کا ہجوم
گورج اٹھتا ہے اک آوازہ شیشا اللہ
گھول دیتا ہے جو ہر جڑ قہوہ میں زقوم

شہر و صومال میں پئے جاتے گی کب تک یہی جھوک
مام کب ہوں گے الدین کے جادو کے چلن
کوئی شمس زادہ نہ لاتے گا کوئی ربوہ مسلم
کوئی انسان کو بتاتے گا کوئی راہِ مسدود

اب بنار و سمرقند کی راہوں سے نسیم

لایا کرتی ہے دم صبح بہاروں کے پیام
اور ہر پھول سے کہ جاتی ہے چٹکے چٹکے
تم بھی چاہو تو بدل سکتے ہو گلشن کا نظام

تم کو آدم کے مقدّر کے جگانے کے لیے
بابل دینوا کے ساحر نہ لانے ہوں گے
مصر و بغداد کی بجڑی کے بنانے کے لیے
مصر و بغداد کے جہور جگانے ہوں گے

ورنہ کچھ صبح کے بھرتا ہی رہے گا آبیں
شاہی ڈیوڑھی پر سید بخت غلام زرنگی
اور ہر موڑ پہ آوازۂ مشیتا رنڈے
ہر مسافر کے تعاقب میں رہے گا یونسی

ابن انشاء کا وہ تمنا ہوا چہرہ مجھے آج بھی یاد ہے جب اُس نے نظم نہانے کے
بعد اپنی مخصوص مدح میں ٹڑپیں سکرانٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا تھا۔
"ارے! چاہتے تو ٹھنڈی ہو گئی۔"
"اور منگوائے ہوں!"

اس طویل نظم نے مجھے اپنے ظلم میں قید کر لیا تھا۔ ابن انشاء بڑی سادگی
اور بے ساختگی سے نظم سنا چلا گیا تھا اور اس کا ظلم میرے ارد گرد پانا جالا
بنتا چلا گیا تھا۔ مجھے دجلہ اور فرات کی وادی کے وہ داستان گویا دار ہے تھے
جو ستاروں کی پھاڑوں میں برافق سراؤں کے باہر قالیبتوں پر بیٹھے مصریوں کی
کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ مجھے زبیدہ کے شہستان میں ٹنگتے خود و غیر کی مہک

میں آ رہی تھی اور ارض حبش کے غلاموں کی سسکیاں بھی سنائی دے رہی تھیں۔
اس نظم میں رومانیت اور حقیقت پسندی کے تضاد سے پیدا ہونے والا
ابن انشاء کا فن اپنے مزاج پر تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ابن انشاء نے نظم دو
تین برس سے لکھ رہا تھا اور بیچ میں کبھی کبھی اُس نے مجھے اس کے کچھ بندوں کے
بھی سنے تھے، لیکن پوری نظم اُس روز میں نے سنی۔ میں ابن انشاء کے لیے چائے
کی دوسری پیالی بنانے لگا تو اس کی خوشبو نے ملک زبیدہ کے شہستان میں ٹنگتے
خود و غیر کی مہک سے مل کر مجھ پر مادہ کر دیا۔ گرم سنہری چائے پیالی میں گر رہی
تھی۔ ڈوبتے سوز کی سیال کر نہیں پیالی میں گردش کر رہی تھیں۔ بغداد کی ایک
رات، چائے کی پیالی میں سمٹ آئی تھی۔ میں نے پیالی ابن انشاء کے سامنے رکھتے
ہوئے کہا۔

ہتماری نظم سن کر میرے کان گرم ہو گئے ہیں۔

ایک خوش پوش نوجوان اپنے اورو کوٹ پر سے بارش کے قطرے چھڑاتا
رہے توران میں داخل ہوا۔ باہر بارش مغرب ہو گئی تھی، بغداد کی ایک رات۔
لاریش باغ کے گھنے درختوں پر گرتی بارش اور مال روڈ پر پھیلی دھند اور نورنگیز
کی خوشبو دار گرم چائے اور کربوں اے کا گہرا پراسرار انگشت تلوار۔ میرا چہرہ
سرخ ہو گیا۔

ابن انشاء! یہ دن مجھے یاد رہے گا۔

لیکن اُس دن کو یاد کر کے آج میری آنکھوں میں آنسو آجائیں گے یہ بات
میرے دم و گن میں بھی نہ تھی۔

گلابوں کے شبنم مکھڑے۔۔۔ یہ سب انشاء کی یادوں کی نشانیاں ہیں۔ اُس کی یادوں کے قُطب نما ہیں اور یہ سب نشانیاں، یہ سارے قُطب نما مجھے ابن انشاء کی طرف ہی سے جانتے ہیں۔ لاہور کی ہر گلی ابن انشاء کے مکان کو جاتی ہے۔ اسی مکان کی یاد دلاتی ہے۔ لارنس مارنہ کے درختوں پر اُس کی یادیں کندہ ہیں۔ پاک فٹی اڈس کی فضا میں اس کی خاموش آوازوں کی تھر تھراہٹ ہے اور لاہور کے آسمان پر طوں جھونے والا چاند اور ابن انشاء کے مکان کے آئینوں والا پتیل کا پیڑ آج بھی اُسے یاد کرتا ہے۔ زرد پستے گرتے ہیں تو ہوا انہیں اڑا کر لے جاتی ہے۔ وہ دُور تکسید پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتے ہیں، لیکن ابن انشاء کے مکان کا آئین خالی ہے۔ اب میں ابن انشاء کو 'سیکس گور' کی آپ بیتی پڑھتے دیکھتا ہوں۔ اس کتاب کے کم دونوں مترالے تھے۔ بعض کتابیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کا مترانگریزی میں ہی آتا ہے۔ بعض کتابوں کے اردو مترالے ایسے ہوتے ہیں کہ انہیں انگریزی یا کسی دوسری زبان میں پڑھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ گور کی آپ بیتی ابھی ان ہی کتابوں میں سے ہے۔ 'سیکس گور' کی آپ بیتی کا اردو ترجمہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے تین جلدوں میں کیا اور اسے 'انجمن ترقی اردو' (ہند) نے چھاپا۔ میرے پاس اس کی تینوں جلدیں تھیں۔ اب دو جلدیں رہ گئی ہیں۔ تیسرا حصہ مجھ سے ابن انشاء نے لیا تھا۔

ابن انشاء نے میری ایک کتاب کے فیڈ پر ایک جگہ لکھا تھا: 'مجھے تمہاری انگریزی کے قریب ان کے موارثہ کی خوشیوں، راجدہ کے عشق، ہریا اور ملک کے عمل کو جوں کا توں لانا چاہیوں، سہاراؤں... اور سیاح و شہنشاہی طبعیت کا بھی انا ہی مدخل ہے جتنا گور کی آپ بیتی کے ایک جز بار پڑھنے کا... وہ ہر چیز کو نئی آنکھ سے دیکھنے کا قائل ہے۔ وہ انسان کی رگوں سے بھی واقف ہے اور دم میں اہلبائے والے اور کھینے والے بچوں کی رگوں سے بھی۔ ہر دُور کو ایک نہ ایک حسیں ہارنیں اور روحانی کرشمہ چند کی ضرورت ہوتی ہے۔ آج کا ایسا قلم کار ہمارا اسے حیدر ہے۔'

ابن انشاء یقیناً ہر شخص کے پاس اپنی یادوں کے ایسے چراغ جلا کر چھوڑ گیا ہے جن کی کو کبھی مدد نہ ہوگی۔ جن کی روشنی کبھی کم نہ ہوگی۔ میری زندگی کا ایک گوشہ بھی اُس کی یادوں کی روشنی سے متاثر ہے۔ میں اس کی آواز بھی سنتا ہوں اور اُسے اپنے سامنے بھی دیکھتا ہوں۔ کبھی کان میں دیاساتی پھیرے ہوئے کبھی منہ کھول کر دانت پر دوانی لگاتے ہوئے کبھی چپکے سے میری مٹھی میں چنور سے ٹھٹھاتے ہوئے کبھی گال چھو کر اس پر مینٹی ریڈر چلاتے ہوئے کبھی بالوں میں لنگھتی کرتے ہوئے کبھی دینک کے فیٹے صاف کرتے ہوئے کبھی میب سے قلم نکال کر اُسے کھڑے ہوئے کبھی پتلا جوت ٹیکر ڈر شرارت سے منکراتے ہوئے کبھی میرے سامنے بیٹھے چائے پیتے ہوئے اور کبھی لاہور کی پراسرار گلیوں کی مدگشت کرتے ہوئے اور کبھی مجھے گور کی آپ بیتی سناتے ہوئے کبھی اُس کی آواز سُنا ہوں اور ہنٹ کر دیکھتا ہوں تو اُس کی شکل دکھائی نہیں دیتی۔ کبھی اُسے اپنے سامنے دیکھتا ہوں اور اُس کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ اُس کے جوت بل رہے ہیں، لیکن مجھے کچھ سنائی نہیں دیتا کبھی اُس کی آواز بھی سُنتا ہوں اور اُس کی شکل بھی دیکھتا ہوں۔

مال روڈ کی بارش میں گزرتی دو منزلہ بس۔ پرانے مکانوں کی کابجوں میں غزروں کرتے کبوتروں کی آوازیں۔ پاک فٹی اڈس میں گونجتے قبیلے۔ گور نیگلر کے گلزاروں میں بھی بیکش کی شاخوں کی سرگوشیاں اور لارنس مارنہ کے سُر

ڈاکٹر اعجاز حسین، رائے پوری نے گور کی کی آپ دینی کا ترجمہ اس کا لے سے کیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے گویا گور کی نے یہ کتاب اردو زبان میں لکھی ہو۔ ہم یہ کتاب بڑے مزے لے لے کر پڑھا کرتے تھے۔ ابن الشاذلی کتاب کی درق گردانی کرتے ہوئے سر ہار کر سکرانے جاتا۔ چھر کسی مقام پر بڑک کر کوئی ٹکڑا اسنا شروع کر دیتا۔ جب آئے دن کے جھگڑے سنتے یا تم جے بڑھال کر دیتا تو میں اپنے لیے آپ دعا میں نظم کر لیا کرتا تھا۔ الفاؤ ایک فریاد کی صورت میں مرتب ہو جاتے۔

اللہ میں ہوں کتنا ڈکیا
مجھ کو جھٹ پٹ بڑا بنا دے
جلدی یہ سب پاپ کن دے
جینا ہے دشوار۔ اللہ جینا ہے
یہ بڑھیا شیطان کی خصال
سر پہ لئے کھڑی ہے جالا
کیسی نصیت سے ہے پالا

جینا ہے دشوار، اللہ جینا ہے مشکل
جب راتیں خوشگوار ہوتیں تو مجھے شہر کی سڑکوں کی سروکشت کرنے میں لطف آتا تھا۔ میں تاہیک اور سنان گوشوں میں بھرا کرتا کبھی یوں پھسل چلا جاتا گویا پڑ نکل آتے ہیں اور میں پاند کے ساتھ آکاش میں تیر رہا ہوں۔ میرا سایہ سامنے لڑتا چلتا، برت پر بھیجی ہوئی روٹی کی کولان کو ڈھانچے اور مٹھکہ خیر طریقے سے لہراتے بل کھاتے ہوتے۔ چوکیدار ہاتھ میں ڈنڈا لیے، ابھیڑ کی کمال پہنے ایک کتے کے ساتھ ساتھ گل کو چوں کا چکر لانا کرتا۔ مکانوں سے آدمی نکل کر سڑکوں پر گم ہو جاتے اور گنگا ان کے پیچھے لپک پڑتا۔ کبھی کبھی نیچلی

حسیوں کا جھڑپ ماشقوں کی لڑائی کے ساتھ عوام ہوتا اور مجھے بول عسوس ہوتا کہ میری طرح یہ بھی لکھتا ہے نکل آتی ہیں۔ کبھی کسی روشن دان سے ایک عجیب قسم کی ہلک آتی جو کسی ایسی زندگی کا پتا دیتی جس سے میں منور تا انوس عقار میں کھڑی کے پاس ڈک کر اس مہک کو غیب شونگتا اور سوچنے لگتا کہ اس مکان کے لوگ کس طرح رہتے بستے ہیں۔

(گور کی کی آپ دینی)

اب سنانے کی میری باری ہوتی۔ میں ابن الشاذلی کے ہاتھ سے کتاب لے کر اس کی درق گردانی کرنے لگتا۔ چھر کسی مقام پر بڑک کر پڑھنے لگتا۔

وہ پلٹنڈی کے کنارے بیٹھی تھی۔ ایک رومال پر اس نے روٹی لکھری اور سیب پھیلا رکھے تھے۔ اُن کے بیچ میں شیشے کا بہت ہی خوبصورت سا غزہ رکھا ہوا تھا۔ اُس کے منہ بند پر پنولین کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ نانی نے فرط احسان مندی سے کہا۔
"اہی کیسا سہانا سماں ہے،

میں نے ایک گیت بنایا ہے،

خوب ایس بھی تو سنوں،

میں نے اُسے اپنی ملک بند سنا دی۔

گرمی کے سورج الوداع

تو ہم سے ہوتا ہے بھرا

جائے کا موسم آگیا

میں دیکھتا ہوں برلا

نانی نے نئی ان سنی کر کے کہا۔

مجھے بھی ایک ایسا گیت یاد ہے۔

پھر وہ لنگھنے لگی۔

گرہوں کا سورج چلا سکھی
بھاٹیوں کی اڑت میں سونے کو
میں ساہن بن رہ گئی سکھی
بہشت کی دین میں رونے کو
جب صبور بھی میں اکیلے تھی
پھولوں کی جان کو رونے کو
کھیتوں میں کس کے سنگ پھڑکا
جب دی ہو جوانی کھولنے کو
میری اچھی سکھی میری پیاری سکھی
میرے دل کو نکال لے بیٹنے سے
اور برف میں کر دے دفن اسے
کیا تجھ کو ملے گا بیٹنے سے

نانی نے کہا۔ ایہ ہے جسے دل کی آہ۔ یہ کسی کناری کا بتایا ہو اگیت
ہے۔ بیچارے نے بہار کے مزے بھی نہ لوشے تھے کہ اس کے پیارے نے
بلے وفائی کی اور شاہیہ کوئی دوسرا گھر ڈھنڈلایا۔ یہ بیچارہ دکھ کے مارے
رونے لگی۔ جب تک اپنے پر نہ بیٹھتے تھی اور صفائی سے بیان نہیں ہو
سکتا۔ دیکھو اس دل جلی کے گیت میں کیسے تاثیر ہے۔

(گوری کی آپ بیتی)

یہ کمال احمد حسین رائے پوری کے ترجمے کا تھا کہ ہم پڑھتے پڑھتے اس میں
کھو جاتے۔ دیکھیں کہ بک کے کردار اپنے سامنے چلتے بھرتے بہتے سکراتے، باتیں کرتے
رشتے جھگڑتے نظر آتے۔ ہم نے ایک بار گوری کی آپ بیتی کے انگریزی ترجمے
کی تیئوں جلدیں نکلوں اگر جگہ جگہ سے اپنے پسندیدہ ٹکڑے نکال کر پڑھیں۔

زرا مزہ نہ آیا۔ ہم نے ماسکو پبلشنگ ہاؤس والوں کا چھاپا ہوا اردو ترجمہ بھی دیکھا
مگر نہ

وہ بات کہاں مولوی ملک کی مٹی

اس کتاب کی تیسری جلد میں گوری نے دو نو عمر بچوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک کا نام
چڑکا ہے۔ دوسرے کا نام ششکا۔ دونوں بچے کم سن اور عظیم سے لڑکے ہیں۔ شرارت
میں کرتے ہیں تو بڑی دھیمی دھیمی اور اداں۔ چڑکا، قبرستان کی دیوار پر بیٹھے کوڑوں
کو دیکھتا رہتا ہے اور ششکا کھڑکی کے شیشے سے لگا، کھاؤں کی پگ ڈبڑی پر اڑتی
ٹوہلوں کو اداں نظروں سے دیکھا کرتا ہے۔ ہمیں یہ کردار جانے کیوں پسند آ گئے۔
چنانچہ ہم نے ان کے ناموں پر اپنے نام رکھ دیے۔ میں ششکا بن گیا اور ابن انشاء چڑکا
بن گیا۔ ان دونوں ابن انشاء کو اچھی چلا گیا۔ وہ مجھے پیارے ششکا، کہہ کر خط
لکھتا اور میں اسے پیارے چڑکا کہہ کر خط لکھتا۔ اس زمانے کے کچھ یادگار خط اس
کتاب کے آخر میں آپ پڑھیں گے۔

انہوں نے اب بچڑکا مجھے خط لکھے گا اور نہ ششکا اسے جواب دے سکے گا۔
چڑکا قبرستان کی دیوار پر بیٹھے کوڑوں کو دیکھتے دیکھتے قبرستان میں کہیں کھو گیا
اور ششکا اپنے گھر کی کھڑکی کے شیشے سے لگا، اداں نظروں سے قبرستان کی
خالی دیوار کو دیکھ رہا ہے۔

اس زمانے کا لارنس باغ اور آج کل کا ماغ جناح، لاہور کا خوبصورت
تفریح باغ ہے۔ ہم اس باغ میں اکثر موگشت کرنے جایا کرتے۔ یوں تو اس باغ
میں بے شمار گھنے سایہ دار خوبصورت درخت ہیں، لیکن ابن انشاء کو ایک درخت
بہت پسند تھا۔ یہ درخت باغ کے جنوب میں ریس کورس والی گراؤنڈ کے کونے
میں واقع ہے۔ اقدس کا درخت ہے جس پر ہمیں کے بیٹنے میں پھول آتے ہیں۔
خود چھوڑوں کے لمبوترے گچھے خالوں میں طرح شاخوں میں جگہ جگہ لٹکنے لگتے ہیں۔
خود روشنی کا خوبصورت غار درخت کو چاروں طرف سے پیٹ لیا ہے۔ سو ذرا

تیز جلتی ہے تو پھولوں کی زرد خلی خلی پنکھریاں زمین پر گرنا شروع ہو جاتی ہیں۔
 مٹی کے جینے کی گرم ہوا میں یہ گرمی زرد پنکھریاں بڑی جھلی لگتیں۔ لارنس باغ
 میں مٹی گرم لڑاؤ اس کے اس درخت کی گھن جھاڑوں میں پہنچ کر خشک ہو جاتی
 ہیں اور ابن الشہد الماس کی جھاڑوں میں بیٹھے گھاس اور گلاب کے پھولوں پر اڑتی
 تیتلیوں کو دیکھا کرتے۔ کبھی ہم گھاس پر لیٹ کر اپنے اوپر لٹکتے الماس کے
 زرد پھولوں کو دیکھتے جو ہوا میں جھینٹاؤں کی طرح لہرا رہے ہوتے۔ ابن الشہد
 کہتا۔

”مجھے ان پھولوں کو دیکھ کر چینی نالوس کا خیال آتا ہے۔“

اور میں کہتا۔

”مجھے یوں لگتا ہے جیسے انڈر کے زرد گچھے لٹک رہے ہیں؟“

جب ہم اٹھتے تو ہماری قمیصوں پر سے زرد پنکھریاں گرتیں۔

ایک دن میں ابن الشہد کے گھر گیا تو وہ بڑا خوش خوش تھا اور بالوں میں لکھی
 کرتے ہوئے لنگن رہا تھا۔ دن گرم تھا اور دھوپ میں صبح ہی سے حدت آگئی
 مٹی میں لے چھا۔

”آج بڑے خوش ہو۔ کیا بات ہے؟“

وہ مسکراتا رہا اور بالوں میں لکھی کرتا رہا۔ پھر بٹش شرٹ کا کالر بھیک کرتے
 ہوئے مجھے ساتھ لے کر گھر سے باہر آیا۔

”چلو اپنے درخت کے پاس چلتے ہیں۔ سات ایک نظم ہو گئی ہے۔“

درخت کو بیل کو سنا تے ہیں۔

میں نے کہا۔

”درخت کو سناؤ گے یا مجھے؟“

”کیونے تم میں ساتھ ہی بیٹھے جانا۔“

ہم منگڑی روڑے سے ہوئے لارنس باغ میں آ گئے۔ یہاں درختوں کی دھ

سے قدرے سختی تھی۔ ہم خانہ کلب کے عقب سے نکلے تو سامنے گراؤنڈ میں الماس
 کا درخت دکھائی دیا۔ اس کی شاخیں زرد پھولوں کے چینی نالوس ہلکانے دور
 سے میں اپنے پاس بلا رہی تھیں۔ ہم درخت کی تختہ کی جھاڑوں میں جا کر بیٹھ گئے۔
 میں نے سگریٹ سلگایا۔ ابن الشہد نے بٹش شرٹ کی جیب سے کاغذ نکال کر
 کھولا اور مجھے اپنی نظم سنانے لگا۔ نظم کا موزان ابھی اُس نے نہیں رکھا تھا بعد
 میں یہ نظم پچھلے پہر کے سناٹے میں اُسے عنوان سے شائع ہوئی۔ نظم یہ ہے۔

پچھلے پہر کے سناٹے میں

کس کی سسکی، کس کا نالہ

کمرے کی خاموش فضا میں در آیا ہے

زور ہوا کا لوٹ چکا ہے

نکلے دینے کی حال سے

خفی خفی یونہی چھین کر

سب کونوں میں پھیل گئی ہیں

اور مرے ایشیوں سے

ان کے ہاتھ کا تیکہ بھیک گیا ہے

کتنی ظالم

کتنی گہری تاریکی ہے

گھلا دیکھتے محض کراپ رہا ہے

بھٹی مٹی سوندھی خوشبو جھوڑ رہی ہے

ابر کے گتے، سوچ کے ہادل، یاد کے تارے

کالے امبری جھیلوں میں ڈوب گئے ہیں

کس کے رخساروں کی لڑش دیکھ رہا ہوں

کس کی زلفوں کی شکنوں سے کھیل رہا ہوں
چمکے چمکے ریشے ریشے سوچ رہا ہوں
بچھلے بہر کا ستانا ہے
کس کی سسکی، کس کا نالہ
کمرے کی خاموش فضا میں دہرایا ہے

گھنے درختوں میں پروا کی سیٹی گونجی
دودھ کشوں میں قیدی رد میں پیچ رہی ہیں
خراہوں سے بھوتوں کے سر ٹکراتے ہیں
تھلے کے ایک بڑج کے اندر
ایک پردی — شیشا کی رانی
خندق کے ان دیکھے پانی کی گہرائی
اندر لٹے کے باشتوں سے ماپ رہی ہے
بچھلے بہر کے ستائے میں
کس کی سسکی، کس کا نالہ
کمرے کی خاموش فضا میں دہرایا ہے

ماضی کی ڈیوڑھی کی چلن
کھٹے درپے کی جالی سے
چھن چھن آتیں

روپ کی جوت حنا کی لالی کھ کی بادیں
سوندھی خوشبو، تھنڈی بو ملے گی
گل کے باسی آئینوں میں سے

فردا کے بائیں کا پروا بیگ رہا ہے

سحر زدہ محسوس حسینہ
بہنوں کے شیشا کی رانی
آئینوں میں مٹن شکستہ دیکھ رہا ہے
گھٹے چہرے لڑنے لڑنے
پہچانے ان پہچانے سے
آگے پیچھے آگے پیچھے بھاگ رہے ہیں
تھلے کے آئین کی صورت
کس کی سسکی، کس کا نالہ
کمرے کی خاموش فضا میں دہرایا ہے

پھرتے لوگوں پر اسے لوگو
چاہیں بھی تو نام تمہارے جان سکیں گے؟
یکے دایں تم کو ہمارے
جی بیٹے کی مرینے کی
خوشی ہوئی افسوس ہوا
تم کیا جانو

کس کے ہاتھ کا نتیجہ
کس کے گرم اشکوں سے بھل گیا ہے
کھٹے درپے کی جالی سے چھی آٹھوا
اک ٹکے کو نہرے میں تم
گن گن اجنبی چیزوں کو پہچان سکی

بیویں کیل میں ہارے لوگو
چھوڑے لوگو ہیارے لوگو
برکھ کی ٹہنی راتوں میں
کمرے کی خاموش فضا میں
پچھلے پہر کے سنانے میں
روتے روتے جاگنے والے
ہم لوگوں کو سوینے دو
اپنے آپ میں کھولنے دو

نظم سنانے کے بعد ابن انشاء نے جیب سے رومال نکال کر اپنے ماتھے پر
آپا ہوا پسینہ پونچھا اور نیک کے پیشے صاف کرنے لگا۔ اس کا چہرہ متاثر نہ تھا۔
دن کا ہی گرم تھا اور ہوا بند تھی۔ اماں کے زرد فافوس اپنی شاخوں پر سکن
تھے۔ دھوپ کی چمک سے درخت کی چھاؤں میں زرد بناریا پھیلا تھا جس میں
اماں کے چھوٹوں کی گہری خوشبو بچی ہوئی تھی۔ خوشبو کا یہ زرد بخار پیشے کی
طرف روشن تھا۔ جیسے درختوں کی شاخوں سے ٹپکتے سلسے سے زرد فافوس جگمگااتے
ہوں۔ مٹی کا دن آہستہ آہستہ گرم ہو رہا تھا۔ دھوپ کی دھیمی دھیمی پیش اور
چھوٹوں کی زرد روشنی کا چمکا گرم بخار مجھے ابن انشاء کی نظم کا ایک حصہ معلوم
ہونے لگا تھا۔

کہیں سے ٹھنڈا پانی پیا جائے؟ ابن انشاء نے کہا۔

ہم درختوں کی چھاؤں میں پھلتے اور کھینچے میں آکر سنے میں بیٹھ گئے۔ ہم
نے ٹھنڈا پانی پیا۔ پھر جاتے آگئی اور ہم خدا جانے کس موصوفات پر باتیں کرنے
لگے۔ کبھی ہنستے کبھی شکر اتے۔ ہمیں ہنستا دیکھ کر سنبل کے گھنے پیر پر سرخ
چھوٹوں کے پاس بیٹھیں ایک سنبل میں گردن پیروں کر کے دیکھ رہی تھی۔ سنبلیں
سنبل کے گھنے پیروں پر اب بھی بیٹھتی ہیں۔

لائس باغ کی جنوبی گراؤنڈ میں اماں کا درخت مجھے ہی کھڑا ہے جس دن
کے دنوں میں اس کی ٹہنیوں پر زرد چھوٹوں کے چینی فافوس آج بھی کھینچے ہیں۔
اور ہوا کے ٹپکے سے چھوٹے کے ساتھ جھوٹے گتے ہیں۔ اور بن اتر کھینچے ہیں چائے
کی گرم گرم خوشبو آج بھی شام کی ہوا کے ساتھ اڑتی ہے اور اماں کی چھاؤں
میں روشن دھوپ میں زرد چمکتا بخار چمکتا ہے۔

لیکن وہ جیب سے کاغذ کا پرزہ نکال کر دھیمے دھیمے لیے میں نکلیں سنانے والا
رومال سے اپنی چمک کے پیشے صاف کرنے والا اور سنبل پر بیٹھی سنبل کو دیکھ کر
خوش ہونے والا ابن انشاء نظر نہیں آتا۔ میں اکیلا لائس باغ کی جنوبی گراؤنڈ کی
طرف نہیں جاتا۔ اماں کے زرد چھوٹوں نے مجھ سے پوچھا کہ ابن انشاء کہاں ہے
تو میں کیا جواب دوں گا؟ میں پھر اپنی اتر کھینچے نہیں گیا۔ مجھے یقین ہے سنبل
کی شاخ پر بیٹھی سرخ پتھر والی سنبل مجھ سے عزم پر پچھے گی کہ وہ خرما شکر
نکلیں سنانے والا جو تھارے ساتھ آیا کرتا تھا کہاں چلا گیا؟ تو پھر میں اُسے
کیا جواب دوں گا؟ میں تو یقین آگیا ہے کہ ابن انشاء وہیں چھوڑ کر چلا گیا
ہے، لیکن شاید سنبل کو یقین نہ آئے۔ اور وہ بار بار مجھ سے پوچھتی رہے۔

وہ کہاں چلا گیا؟ وہ کہاں چلا گیا؟

دوسرا دن سانسے کا دفتر میں کلوڈ روڈ سے اٹھ کر لوہاری دروازے آگیا۔ دفتر
کے پیچھے ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جہاں بیٹھ کر سعادت حسن منٹو آتش تر سے شغل کیا
کرتے تھے۔ ایک روز منٹو صاحب کے ساتھ ظہیر کا شہری بھی بیٹھتے تھے۔ ظہیر کا شہری
نے کہا شہری میں زیادہ اچھی لکھتا ہوں۔ منٹو صاحب نے کہا۔

اوتے تمہیں کیا معلوم شہری کیا ہوتی ہے؟

ابن انشاء نے کہا۔

اس کا فیصلہ تو اسی طرح ہو سکتا ہے کہ آپ دونوں حضرات ایک

ایک شہری لکھتے ہیں۔

منٹو صاحب نے سہری جیک کے پیچھے سے اپنی موت موت آنکھیں جھپکا کر کہا۔

”جو عسری ظہیر کا شیریں گاتے گا وہی میں گا کر سادوں گا۔“
ظہیر کا شیریں نے عسری گانی شروع کی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ عسری کے بول تھے۔

سپتال نے انگلی مروڑی رہے
رام قسم میں سراہ گئی۔

خدا جانے یہ عسری حق کو کیا تھا۔ بہر حال ظہیر کا شیریں لبک لبک کر رہا گاتے جا رہا تھا۔ ابن انشاء نے کاغذ قلم لے لیا تھا اور اس پر کچھ لکھتا جا رہا تھا منٹو صاحب آنکھیں لال کیے ظہیر کا شیریں کو دیکھ رہے تھے اور بار بار ناگ نیکو کرنا پسند یہ گئی کا اظہار کر رہے تھے۔ ایک جگہ انہوں نے ہاتھ لہرا کر لغو لگایا۔

”یہ بے شرا ہو رہا ہے“

ابن انشاء نے کہا۔

”میں نے نوٹ کر لیا۔ فکرو کریں۔“

ظہیر کا شیریں چیخ کر بولا۔

”میں نے تمنا زنج اور بھائی لال کو عسری گاتے سنا ہے۔ میں کیسے بے شرا ہو سکتا ہوں؟“

ابن انشاء کہنے لگا۔

”جتنی آپ لوگوں نے مجھے سنا ہے تو فیصلہ بھی میرے اور بھائی میں۔“
ہاں منٹو صاحب۔ اب آپ کی باری ہے۔“

اب منٹو صاحب نے اپنی جتنی سی کمزور آواز میں وہی عسری گانی شروع کی۔ وہ کلاؤتوں کی طرح ہاتھ لہرا لہرا کر رہے تھے اور جب دم پر آتے تو زور سے اپنے گلے پر ہاتھ مار تے۔ ایک بار انہوں نے بے خیالی سے ابن انشاء کے گلے پر ہاتھ

مار دیا۔ ابن انشاء اچھل کر میرے قریب ہو گیا۔ عسری ختم ہو گئی۔ منٹو صاحب اپنی سرخ آنکھوں سے ابن انشاء کو دیکھتے ہوئے بولے۔

”بتاؤ کون سر میں تھا؟“

ابن انشاء نے اپنے گلے جوتے کاغذ کو گردن گھما پھر اگر دو تین بار غور سے پڑھا۔ پھر اسے تہہ کر کے جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔

”میں فیصلہ محفوظ رکھتا ہوں۔“

دونوں گویے غائبی بولتیں انشا کر اس کی طرف پلکے۔ میں اور ابن انشاء دوسرے دروازے سے بھاگ کر گلی میں آ گئے۔ ہنس ہنس کر ہمارا بڑا حال ہو رہا تھا۔

میں مہری شاہ کے ایک محلے ابھی پارک میں رہتا تھا۔ ہمارے مکان کے پچھواڑے انکور کی ایک بیل لگی تھی جس نے آدھے آٹن کو چھانپ لکھا تھا۔ سرویلوں میں اس کے پتے سوکھ کر جھڑ جاتے۔ سیار میں یہ بیل ہرے مہرے پھیلے پتوں سے مبر جاتی اور پھر اس کی چھت میں سے سبز داغ کے کچے پلٹے دکھائی دیتے۔ ایک بار ابن انشاء نے انکور کے گچھوں کو دیکھ کر کہا۔

”اس بار انکور کے بان کا تھیک مجھے دینا۔“

انکور کہتے تو میں ابن انشاء کو بلا کر مزدور کھلایا کرتا۔ یہ کوئی اعلیٰ نسل کے انکور نہیں تھے۔ بس ہرزنگ کی کھٹی مٹھی داغ تھی۔ پھر بھی ہم اسے جیسے سڑے لے لے کر کھایا کرتے اور پھر سبز چلتے بیٹے۔

ایک بار مجھے کیس سے گیتا رائے کے بھنوں کے کچھ ریکارڈ مل گئے۔ ریکارڈ شرمائی قلم جو گن کا آواز والا شران وڈوں لاہور میں بڑا رش لے رہا تھا اور پاکٹی ہاؤس میں بیٹھ کر ہم لوگ میرا بانی کا یہ جین بہت گنگنا یا کرتے تھے۔

جوگی مت جانت جا

پاؤں پڑوں میں تیرے

میں نے ابن انشاء کو بتایا کہ میرے پاس گیتا راتے کے جھین آئے ہیں۔ کسی روز گھر آؤ۔ تمہیں سناؤں گا۔
ابھی پتلے ہیں۔

ابن انشاء کو لے کر گھر آگیا۔ انگور کی بیل برسے بھرے پتوں سے بھری ہوئی تھی۔ ہم بیل کی چھاؤں میں بیٹھ گئے۔ گراہون پر گیتا راتے کا ریکارڈ چڑھا دیا۔ آجی باورچی خانے میں ہنر چاتے تیار کرنے لگیں۔ موسم بڑا خوشگوار تھا۔ میں نے بیشک میں جینا اگر جی سکا دی تھی جس کی خوشبو آنگن میں بھی آرہی تھی۔ یہ بھی شروع ہو گیا۔ یہ فلم جوگن کا ایک ایسا بھجن تھا جس کو ہم نے کبھی کسی ریڈیو سٹیشن سے نہیں سنا تھا اور لاہور میں بھی اس کا ریکارڈ دستیاب نہیں تھا۔ شروع میں سارے ساتھ بھری کا ایک ٹکڑا اچھا اور پھر گیتا راتے کی آواز گونجی۔

انشت چلے او دوت

شرعی میں کوئی نہ براہے

پنقی تھا سو پنقہ سدھارا

آسن پڑی ہے بھجھول

سچی سہلی کوئی نہ اپنا

سر پر خیم کا دوت

میرا کے پر بھو بندھن ٹوٹا

ٹوٹا کا چا سوت

بھجی ختم ہو گیا۔ ہنر چاتے آگئی۔ ابن انشاء کچھ دیر میرا بائی اور کبیر واس کی شامری پر بائیں کو تار ہا۔ پھر بھگتی لہر پر گنگو شروع ہو گئی۔ بات سرسید تک پہنچنے والی تھی کہ میں نے گراہون کو چابی دیتے ہوئے کہا۔

یار چھوڑوان باتوں کو۔ تم گیتا راتے کو سنو :

ہاں گیتا راتے کو ضرور سناؤ :

ہنر چاتے کا دوسرا دور بھی چلا۔ ساتھ باقر خانیان بھی تھیں۔ ابن انشاء کو ہمارے گھر کی ہنر چاتے بہت پسند تھی۔

یار یہ چاتے صرف امرتسری کشمیری بنانا جانتے ہیں۔

مفل ختم ہوئی تو ہم مصری شاہ کی گلیوں سے نکل کر دہلی دروازے آ گئے۔ ابن انشاء کہنے لگے۔

”شہر کے اندر سے ہو کر پاک فی اؤس پتلے ہیں۔“

چنانچہ ہم دہلی دروازے میں داخل ہو کر سنہری مسجد کی طرف آ گئے۔ چوک وزیر خان کی ایک دکان سے ہم نے قہقہے کا قلم لیا اور وہیں کھڑے کھڑے کھانا شروع کر دیا۔ رنگ مل پنچے تو بجائے شاہ عالمی کی طرف مڑنے کے ہم میرا منڈی کی جانب ہو گئے۔

دارے تم مجھے خراب کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔

ابن انشاء کی اس بات پر میں ہنس پڑا۔ پانی والے تالاب میں ایک عطا کی دندان سازی دکان کے باہر لکھا تھا۔

”یہاں آرام کو سی پر بٹھا کر دانت نکالے جاتے ہیں۔“

ابن انشاء یہ تحریر پڑھ کر بڑا ہنسا۔ اُس نے دو تین فقرے چمتے کئے جو مجھے اب یاد نہیں رہے۔ یہاں سے ہم گھاٹی آ کر کریمیاں ایم اسلم کی حویلی کو دریں جانب پیچھے چھوڑتے ہوئے میرا منڈی میں آ گئے۔ دن کے وقت بھلا یہاں کیا کوئی خراب ہو سکتا تھا۔ ابن انشاء معذور اور اہم بھائی گیٹ کی طرف مڑ گئے۔ ابھی اورنجی مسجد دُور تھی کہ بائیں جانب استاد امانت علی خان کا مکان آ گیا۔

میں نے کہا۔

”جو امانت علی سے ملتے ہیں۔“

دو ایک مکالموں کے بعد مجھے گزرتا ہم استاد امانت علی خان کے دروازے پر پہنچے۔ یہ مکان خستہ حالت میں تھا۔ بعد میں امانت علی خان یہاں سے اٹھ کر

تعلے کے پاس والے چار منزلہ کچے مکان میں آگئے تھے۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ معلوم ہوا کہ امانت علی ابھی ابھی کہیں گئے ہیں۔ ہم بھائی گیٹ سے باہر نکل آئے۔ یہاں سے بائیں طرف باغوں باغ ہوتے ہوئے لوہاری دروازے پہلے اور پھر انارکلی کی سیر کرتے پاک ٹی اؤس آگئے۔ یہاں بھی احباب حسب معمول جمع تھے اور دنیا جہاں کی باتیں ہو رہی تھیں۔ ہم اس گٹھگو میں شامل ہو گئے۔

ابن انشاء کو راجی چلا گیا۔

اب وہ لاہور نہیں رہنا چاہتا تھا۔ اس کی ایک بڑی چھوٹی سی مگر بڑی گہری جذباتی وجہ تھی۔ دو ایک بار اس نے مجھ سے اس جذباتی وجہ کا ذکر کیا تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ میں نے اس سے زبردستی ذکر کروایا تھا۔ ایسے معاملوں میں وہ بڑی شفیقہ قسم کی رازداری سے کام لیتا تھا۔ بہر حال چونکہ یہ اس کی خالص ذاتی پسند اور ناپسند کا معاملہ تھا اس لیے میں سوائے خاموش رہنے کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اب اس جذباتی وجہ کو بیان کرنے کی ضرورت بھی نہیں رہی۔ اس معاملے میں وہ میرا اس رشتے کو اختیار کرنے کا مجاز تھا جسے وہ اپنے لیے بہتر سمجھتا ہو، لیکن انسان اس دنیا میں جس رشتے پر بھی چلے، آگے چل کر اس کے نتائج ضرور متب ہوئے ہیں۔

بہر حال کراچی جانے پر ابن انشاء غرض تھا اور میں اُسے ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتا تھا۔ ان ہی دنوں میں دو ایک روز کے لیے کراچی گیا۔ مجھے اب ابھی طبع یاد نہیں۔ شاید وہ ریڈیو پاکستان کراچی کی عمارت تھی۔ ابن انشاء ایک بڑے سے کمرے میں بیٹھا خبروں کا ترجمہ کر رہا تھا۔ اسی نے میرا تعارف اپنے دو ایک بزرگ ساتھیوں سے کروایا جن کے اسمائے گرامی اب مجھے یاد نہیں رہے۔

فقیح صدر تیس بیس ہویا دون کی لوح پر دھند لگائی ہیں۔ میں کراچی میں کسی دوسری جگہ پر پھنسا ہوا تھا۔ ابن انشاء کے ہاں نہ جاسکا۔ ابن انشاء کراچی سے جب بھی لاہور آتا مجھے ملنے میرے بیوہ منڈی نلیوگ روڈ والے مکان پر مقرر آتا۔ پھر ہم شہر کی پڑا سرائی گلیوں کی سیر کرتے، مدرس باغ میں اپنے پرانے ساتھی، اہلس کے زرد چھوٹوں والے درخت سے جا کر ملنے، اوجھن ایر کیٹے یا لورینگر ریسٹوران میں بیٹھ کر چائے پیتے۔ خوب باتیں کرتے ایک دوسرے کو نئے نئے لطیفے سناتے۔ ہنستے ہنساتے۔

مرکز اردو کراچی کے مالکان برادر عزیز خالد صاحب اور برادر مختار صلاح الدین صاحب میری دو کتابیں چھاپ رہے تھے۔ اس سلسلے میں مجھے کراچی جانا پڑا تو میں ابن انشاء کے پاس جا کر پھنسا۔ ابن انشاء جہانگیر روڈ پر رہتا تھا۔ اسی پستہ پر میں اُسے خط بھی لکھا کرتا تھا۔ ایک چھوٹا سا باغچہ تھا۔ چھوٹا سا برآمدہ تھا۔ جہاں اس کے ہم کی تختی لگی تھی۔ سامنے والے کمرے میں کھڑکی کے ساتھ لوہے کا ایک پٹنگ بچھا تھا۔ صوفے پر سامنے پڑے تھے۔ کونے میں تپائی پر بھی کتابیں ڈھیر تھیں۔ الماری بھی کتابوں سے بھری ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر ابن انشاء خوش ہوا۔ کہنے لگا۔

”تم کسی غلط گھر تو نہیں آ گئے؟“

میں نے کہا۔

”مجھے اس گھر سے اہلس کے زرد چھوٹوں کی خوشبو آ رہی ہے۔“

میں نے ٹیوٹوٹائی۔ غل کیا۔ کپڑے تبدیل کئے۔ کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ ابن انشاء بڑی محبت سے مجھے ہر ایک خوشی میں سے سائل نکال نکال کر دے رہا تھا۔ پھر خالص دیس گئی میں علی ہوئی شکر آگئی۔ یہ ابن انشاء کے گھر کی خاص خوشی تھی جو مجھے بڑی پسند تھی۔ جیسا دیس گئی میں نے ابن انشاء کے گھر دیکھا ویسا پھر بہت کم نظر آیا۔ آپس میں ہنسی مذاق کرتے لاہور کی

بائیں کرتے کھانا ختم کیا۔ چائے پی اور میں اردو مرکوز کی طرف چل نکلا۔

دوسرے روز میں اور ابن انشاء آ گئے گھر سے نکلے۔ کراچی کے احباب سے ملاقات کی۔ ہر طرف محبت، انعام جوشی اور اخلاص کی فضا تھی۔ مسعود تابش نے کمال محبت سے دعوت کا اہتمام کر کے میری عزت افزائی کی۔ ان کے ہاں بولڈیز کوٹنے کھاتے ان کی خوشبودار یاد ہمیشہ میرے ساتھ رہے گی۔ ابو الفیر کشفی کے ساتھ محفل لگی۔ شاہد احمد دہلوی کے نیاز حاصل کرنے پر پیشکش کیا۔ بڑی شفقت سے ملے اور فرمایا۔

”میاں آج رات کا کھانا ہمارے ہاں کھائیے گا۔“

یہ میرے لیے بڑا اعزاز تھا۔ میں شاہد صاحب کا مداح تھا۔ ”وہ برابر کمال مہربانی سے مجھے بھیجا کرتے تھے اور میں بڑے شوق سے پڑھا کرتا تھا۔

شام گھری ہوئی تو میں ابن انشاء کے ساتھ جہانگیر روڈ والے مکان سے چل پڑا۔ سڑک پر آ کر شاید رکشا لیا یا پیدل ہی روانہ ہو گئے، کیونکہ مجھے یاد ہے،

ابن انشاء نے کہا تھا کہ شاہد صاحب کا مکان زیادہ دور نہیں ہے۔ شاہد صاحب نے بڑا اہتمام کر رکھا تھا۔ محمد حسن عسکری صاحب، زبیری صاحب اور جمیل جالبی

صاحب بھی تشریف فرما تھے۔ ایسے ایسے استادان فن کے آگے بھلا میں کیا بات کرتا۔ بس برما اوکسیلون کے دفتروں کی باتیں کرتا رہا۔ عالمانہ گفتگو شروع ہوتی

تو ابن انشاء کو آگے کر دیتا۔ ابن انشاء ہر موضوع کے علمی ادبی موضوع پر بڑی فاضلہ گفتگو کرتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا مطالعہ بڑا وسیع تھا اور پھر اُسے بات

کرنے کا سلیقہ بھی آتا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ موقع مل کے مطابق فقرے بھی چلت کرتا جاتا تھا۔ ان ہی دنوں کراچی کے ایک رسالے ادب میں میرا ایک مزاحیہ مضمون

”قرعے ایک خط“ چھپا تھا۔ ابن انشاء کو یہ مضمون بہت پسند تھا۔ اُس نے میرے اس

مضمون کی بات طرز کو ردی اور میں اس محفل میں عالمانہ موضوع پر احمقانہ باتیں

کرنے سے بچ گیا۔

کھانا بے حد تکلف تھا۔ جب میں فوجی جماعت میں پڑھا تھا تو وہی میں ایک بار خواجہ حسن نظامی کے دسترخوان پر بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ شاہد صاحب کی دعوت میں اس یادگار محفل کی یاد تازہ ہو گئی۔ وہی کے خاص خاص پکوان پکے تھے۔ کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔ انجمن ترقی اردو اور مولوی عنایت اللہ صاحب کے حیرانی تراجم کی بات شروع ہو گئی۔ میں نے بڑی حسرت سے غلامیہ کے ناول اسلام آباد کا ذکر کیا جسے مولوی عنایت اللہ نے ترجمہ کیا تھا اور جو مجھ سے کم ہو گیا تھا۔ شاہد احمد صاحب نے کمال مروت سے کہا۔

”میاں اس کتاب کی دوا آخری جلدیں میرے پاس رکھی پڑی ہیں۔ بے شک تم لے جاؤ۔“

انہوں نے اسلام آباد کے دو قریبی محلے رحمت فرما دیے جو آج بھی میرے پاس ایک قریبی یادگار کی طرح محفوظ ہیں۔ رات گہری ہو گئی تھی کہ ہم شاہد احمد صاحب کے گھر سے واپس ہوتے۔ بڑی خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔

ام پیدل ہی جہانگیر روڈ کی طرف روانہ ہو گئے۔ ابن الشام کہنے لگا۔

”تم نے شاہد صاحب سے کتابیں تو رانی ہیں اب الیا کو دیکھ کر انہیں میرے پاس ہی چھوڑ جاؤ۔ لاہور میں تم سے ادھر ادھر ہو جائیں گی؟ میں نے کہا۔

”پیارے تمہیں تو میں ان کی ہوا بھی رزقے دوں گا۔“

”اچھا چلو پہلا صبر مجھے دیتے جاؤ۔ پڑھ کر دوسرا صبر بے شک بعد میں سمجھو اور بنا۔“

میں نے سڑک پر ہی اُسے بازوؤں میں پکڑ لیا۔ وہ ہنستا بھی جاتا تھا اور کہے بھی جاتا تھا۔

”اوتے کہنے کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا۔“

میں نے کہا۔

”پہلے دھوکہ کرو کہ تم مجھ سے کتاب نہیں مانگو گے۔“

ابن الشام اپنی جگہ سنبھالتے ہوئے بولا۔

”اچھا بابا وعدہ کرتا ہوں۔ جہاں تمہارے پاس پہلے میری اتنی کتابیں ہیں وہاں یہ بھی سہی۔“

”اسے پہلے کوئی کتاب دی ہے تو نے مجھے۔“

میں نے اُسے چھوڑتے ہوئے پوچھا۔ کہنے لگا۔

”یاد نہیں وہ کتاب۔ ورلڈ میس مینس ان آؤٹ لائن؟“

”ارے ہاں یاد آیا۔ مگر وہ تو ایک کتاب ہے۔“

”اس ایک کتاب میں انٹیلی پچاس کتابوں کا خلاصہ دیا ہوا ہے۔ اس اعتبار سے تمہارے پاس میری پچاس کتابیں ہیں۔“

یہ انگریزی کتاب میں نے لاہور میں ذریعہ ابن الشام سے پھینک لی تھی۔

اس کتاب کے پہلے صفحہ پر اندر کوئے میں ابن الشام نے اپنے ہاتھ سے انگریزی میں لکھا ہے۔

S. M. Basmah

6. Nov. 1946

درمیان میں اُس نے اُنڈو میں ”ابن الشام“ لکھا ہے۔ نیچے ایک مہر لگی ہے جہاں لکھا ہے۔

”دی انگلش بک ڈپ“

انٹرنیشنل کونسل

یہ کتاب اس وقت بھی میرے ساتھ شیلیٹ میں رکھی ہے اور مجھے میرے دوست کی یاد دلا رہی ہے۔

ہم مسکراتے بیٹے بیٹو کوئی کہتے جہانگیر روڈ والے مکان پر آ گئے۔ کچھ دیروایاں تھیں

میں بیٹھ کر باتیں کرتے رہے۔ پھر میں اُسی کمرے کے چانگ پر سو گیا۔ صبح ناشتے کے بعد ہم برآمدے میں بیٹھے تھے کہ ایک فقیر سارنگی بجاتا ہوا سامنے سے گزرا۔ میں نے ابن انشاء سے کہا۔

”کیا تم اپنے مہمان کو سارنگی نہیں سنواؤ گے؟ تیلیف ہارون الرشید کے بغداد میں تو میزبان اپنے مہمانوں کو وہ برتن بھی دے دیا کرتے تھے جن میں انہیں کھانا کھلایا جاتا تھا۔“
ابن انشاء نے کہا۔

”ایسا وہ لوگ متعدی امراض سے بچنے کے لیے کیا کرتے تھے۔ بہر حال اگر تمہیں ناشتے کے بعد بھی موسیقی کی طلب محسوس ہو رہی ہے تو فقیر کو بلا کر سارنگی سن کئے جو۔“

میں نے فقیر کو آواز دے کر بلایا اور اُسے سارنگی ملانے کو کہا۔ فقیر نے دھڑا دھڑکن چلنا شروع کر دیا۔ جب وہ تھک گیا تو روک گیا اور میری طرف داد طلب نظروں سے دیکھنے لگا۔ میں نے ابن انشاء کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”اس گھر کے مالک یہ صاحب ہیں۔ ان سے مانگو جو لینا ہے۔“
ابن انشاء نے اپنی اکوتی گالی دیتے ہوئے کہا۔

”جو امر اسے اسارنگی تم نے مٹی ہے۔ میں اسے پیسے کیوں دوں؟“

”لیکن تم بھی تو میرے ساتھ ہی سن رہے تھے۔“

”سن کہاں رہا تھا مجھے تو اس کی آواز آرہی تھی۔“

”تو چلو اس کی آواز کے ہی دور سے دے دو۔“

بڑی مشکل سے ابن انشاء نے عجب سے ایک روپیہ نکال کر کہا۔

”لو یا با! آٹھ آنے واپس دینے کی ضرورت نہیں۔“

میں اٹھ کر ابن انشاء سے ہٹ گیا۔ زبردستی اس کی جیب سے مزید ایک

روپیہ نکال کر فقیر کو دے دیا اور کہا۔

”بابا! تم روز صبح آکر صاحب کو سارنگی سنا جایا کرو اور روپیے لے جایا کرو۔“

ابن انشاء نے ہنستے ہوئے کہا۔

”کل یہ آتے گا تو میں پہلے ہی سارنگی بجا رہا ہوں گا۔“

میں نے کہا۔

”تم ایسا کرنا۔ اس فقیر کو اپنی نظلیں سنائی مشورہ کر دینا۔ خدا کی قسم پھر کبھی یہ ادھر کا رخ نہیں کرے گا۔“

کتنی چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں، لیکن ہم کس قدر غور ہو ا کرتے تھے۔ کس قدر ہنسنا کرتے تھے۔ شاید زندگی کی سب سے عظیم خوشیاں زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں ہی پوشیدہ ہوتی ہیں۔ ہنستے ہنستے ہمارے بیٹ میں بل پڑ جاتے اور بات فصاحتی ہوتی تھی کہ ہم نے سڑک پر سے گزرتے کسی ایسے شخص کو دیکھ لیا جو بطح کی طرح چل رہا تھا۔ کسی لڑکے کو سکول کی دیوار پر بیٹھا دیکھتے تو ابن انشاء اشارہ کرتا۔

”ارے! وہ دیکھو گور کی کاشٹکا بیٹھا ہے۔“

اور ہم قدر تک ہنستے چلے جاتے۔

ہم گھر سے اٹھتے نکلے۔ ابن انشاء کو اُس کے دفتر چھوڑ کر میں اردو مرکز گیا۔ دوپہر کا کھانا میں نے براہِ عزم صلاح الدین کے ساتھ کھایا۔ تیسرے پہر میں نے ابن انشاء کو دفتر سے لیا اور ہم کافی باتیں آگئے۔ یہاں تک ایک دوستوں سے ملاقات ہوئی۔ یہاں سے اٹھے۔ مجھے سڑک پر آتے تو میں نے سمندر سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ابن انشاء بولا۔

”لا ہور سے جو ادیب شاعر آتا ہے سمندر کی طرف چل پڑتا ہے۔ اسے

وہاں کیا رکھا ہے۔“

”میں یا سمندر دیکھنے چلتے ہیں۔“

ہم کاشف پر آگئے۔ کراچی کا سورج سمندر کے اوپر چمکا ہوا تھا۔ دُور دُور سے
 بڑی بڑی لہریں آ رہی تھیں۔ تیز ہوا چل رہی تھی۔ ہم ٹیکس چنے کھاتے سمندر
 کے ساتھ ساتھ ریت پر سریر کرتے گئے۔ سمندر کے بارے میں ابن انشاء زیادہ جذباتی
 نہیں تھا۔ ہاں اگر سمندر کی لہروں سے زرد چاند طلوع ہو رہا ہو تو وہ سحرورہ ہو
 کر اُسے دیکھا کرتا۔ یہاں بھی وہی چاند اُسے اُنٹ کرتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ چاند
 شروع دن سے اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ یا ابن انشاء روز اول سے چاند کے تعاقب
 میں تھا۔ کراچی کے سمندر کا ساحل میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ ویران ویران۔
 درختوں کے بغیر۔ مجھے یہ ساحل پسند نہ آیا۔ میں نے جنوب مشرقی ایشیاء کے سمندروں
 کے ساحل دیکھے تھے۔ جہاں ناریل کے جھنڈے کی ہوا میں جھومتے ہیں۔ اور تیز بادلوں
 میں جہازیں ناریل کی دھک سے کراساں پر چلتی ہیں۔ یہاں ناریل کا ایک بھی
 درخت نہیں تھا۔ کوئی ملائی، بری یا سنہالی لوگ زرد کیلوں کا گچھا اٹھاتے تاکڑے
 درختوں میں اپنی جھونپڑی کو جاتی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

ریت پر سپیاں اور گھونگھے جگہ جگہ بکھرے پڑے تھے۔ ہم دونوں سپیاں
 اکٹھی کرتے گئے۔ میں نے کہا۔

”کراچی کا سمندر بڑا خوبصورت ہے۔ اس کا رنگ زرد کا رنگ ہے۔

لیکن ساحل پر ایک بھی درخت نہیں ہے۔

ابن انشاء نے کہا۔

”کچھ تصور سے بھی کام لینا چاہیے نہیں۔ ویسے یار ایڈگر امین پونے

اپنی نظم میں ایک جزیرے کا ذکر کیا ہے جس کے ساحل پر پتھر سے

چوڑے پتھر والے بڑے ہی گنجان درخت ہیں۔ میں کبھی نہ کبھی اس

جزیرے میں ضرور جاؤں گا۔ کیا خیال ہے؟“

”اگر وہ جزیرہ آدم خوروں کا جزیرہ نکلا تو پھر کیا کرو گے؟“

ابن انشاء نے ہنس کر کہا۔

”اس سے مجھے ایک کارٹون یاد آگیا۔ دو آدم خوروں نے ایک انگریز
 کو تیل کے گڑبے میں ڈال رکھا ہے۔ ایک آدم خور کچلے کے نیچے
 خشک لکڑیاں لگا رہا ہے اور دوسرا آدم خور اُس انگریز سے پوچھ
 رہا ہے۔ تمہارے پاس ماچس ہو گی؟“

اس کارٹون پر ہم دونوں ہنس رہے۔ اس سے مجھے یاد آ گیا کہ ہم لاہور
 میں انگریزی فلموں کے ساتھ دکھائے جانے والے کارٹون بڑے شوق سے دیکھا
 کرتے تھے۔ یہ کارٹون فلم کے شروع میں دکھائے جاتے، چنانچہ ہم فلم شروع ہوتے
 سے بہت پہلے سینما ہال میں جا کر بیٹھ جاتے تھے۔ اس خیال سے کہ کارٹون پورا
 دیکھیں۔ اُن دنوں لاہور کے سینماؤں میں والٹ ڈیزنی اور ڈیوڈ مینڈل کے بڑے
 ہی کلاسیکی قسم کے کارٹون دکھائے جاتے تھے۔ جنہیں دیکھ کر ہمارا ہنس ہنس کر
 بڑا حال ہو جاتا تھا۔ یا پھر ہم کچھ زیادہ ہی ہنسا کرتے تھے۔ عام طور پر ایسا ہوتا
 کہ سینما ہال میں لوگ خاموش رہتے اور ہمارے ایکدم سے قہقہے بلند ہوتے۔ کسی
 شوگرش کو آنکھ مار کر گاہر کھاتے دیکھ کر یا کسی چوہے کو سنبھل سنبھل کر بتلی
 کے پیچھے سے گزرتا دیکھ کر ہم اپنی ہنسی ضبط نہیں کر سکتے تھے۔

باتیں کرتے، ہنستے، شکراتے، سپیاں اکٹھی کرتے ہم ساحل سمندر پر کاف

دور تک نکل گئے۔ ایک جگہ بیچ پر بیٹھ کر ہم نے چائے پی اور پھر واپس ہوئے۔

اسلامیہ کالج کے طلباء اور اساتذہ نے مجھے یہ اعزاز بخشا کہ مجھے اپنے کالج

میں بلایا۔ میرے فن کے بارے میں کچھ اصحاب نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

ابن انشاء نے اپنی تعارفی تقریر میں حاضرین کو بڑے دلچسپ انداز میں میرے

بارے میں بتایا۔ مجھے اس کے جملے یاد نہیں رہے۔ ہاں اتنا یاد ہے کہ تقریر کرتے

ہوئے وہ خود بھی ہنس رہا تھا اور طالب علم بھی محفوظ ہو رہے تھے۔ البتہ میں ضرور

اُسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ تقریب کے بعد گھر آکر میں نے

اُسے پکڑ لیا۔

اب بتا۔ وہاں کیا کہہ رہا تھا؟
 ابن انشاء آگے آگے تھا اور میں پیچھے پیچھے۔ وہ بار بار میکہ گورہ کے کوزار
 پر کھڑکی کی زبان میں سے دہرائے جاتا تھا۔
 "اسے سٹکا! یہ تو میری کپ ہے ما
 "اسے پھر کا اچھے کی ضرورت معنی ایسی باتیں کہنے کی؟"
 ابن انشاء نے بے اختیار کہا۔
 "حالات اور فسادات"

اور ہم دونوں کھل کھلا کے ہنس پڑے۔ اصل میں "حالات اور فسادات" لاہور
 کے ایک مشہور و معروف ناشر کا عجیب کلام تھا۔ پاکستان کو بنے ہی کوئی دو ایک سال
 ہوئے تھے۔ کتاب اگر وقت پر نہ چھپ سکتی تو کہتے۔
 "کیا کروں۔ بس حالات اور فسادات"

ایک بار میں اور ابن انشاء نے پروگرام بنایا کہ لورینگز میں بیٹھ کر بہترین
 فوٹو لیک اڑاتے ہیں اور چائے کے ساتھ اعلیٰ خاندانی منگنیوں کا لطف اٹھاتے
 ہیں۔ اس نے اپنے موٹے میٹھوں والی بینک کے پیچھے سے گھورتے ہوئے کہا۔
 "بل کون ادا کرے گا؟"

میں نے اسے بتایا کہ اس مشہور و معروف پبلشر کے پاس چلتے ہیں۔ ان کی
 طرف میری کتاب کے کچھ پیسے نکلتے ہیں۔ انہیں وصول کر کے لورینگز کا بل ادا کر
 دیں گے۔ ابن انشاء نے جب کہ کہا۔

"سیکیم تو مجھے پسند آتی ہے لیکن ذرا حالات اور فسادات کا بھی خیال
 رکھنا ہو گا۔"
 "تم نکر دو۔ آؤ میرے ساتھ۔"

ہم دونوں ناشر صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ اس زمانے کے ناشروں سے پہلے
 کا قتا قتا کرنا بڑے دل گروئے کا کام تھا۔ ویسے اس کام کے لیے آج بھی بڑا دل گروہ

چاہیے۔ ہر حال ہم ملکہ سیک کے بعد بیٹھ گئے۔ ناشر صاحب کوئی خط لکھ رہے تھے۔
 بڑی خندہ پیشانی سے۔ اس کے بعد وہ ہمیں بھول گئے۔ ابن انشاء مجھے پاؤں
 سے ٹپکے دینے لگا کہ پیسے مانگو۔ میں اس ڈر سے پیسے نہیں مانگ رہا تھا کہ کہیں وہ
 انکار نہ کر دیں۔ ایک بار ناشر کا علی نے مجھے کہا تھا۔

"پیارے! پبلشر سے پیسے وصول کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ
 کرنا ہے ہی کہ وہ جناب میرے پیسے عمارت کر دیجیے۔"
 ناشر کا علی کا خیال درست تھا کیونکہ اگر پیسے نہ بھی ہیں تو کم از کم آدمی اس
 بھیانک کوفت سے بچ جاتا ہے جو پیسے نہ مانگ کر وہاں دو گھنٹے بیٹھنے سے ہوتی ہے۔
 "پیارے! اگر تم نہ ہاتے ہی پبلشر پر حملہ نہیں کیا اور اسے کچھ وقت
 دے دیا تو پھر تمہاری سپاہ تتر بتر ہو جائے گی اور تم بے نیل، مرام
 واپس آؤ گے۔"

میرے ذہن میں ناشر کا علی کے جملے گونج رہے تھے اور میری سپاہ تتر بتر
 ہونے لگی تھی۔ قیسری بار جب ابن انشاء نے مجھے زو کا ٹھوکا دیا تو میں قتا قتا کر بیٹھا۔
 ناشر صاحب بدستور خط لکھنے میں مہمک تھے۔ انہوں نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں میں
 دوسری بار جھک کر دالا تھا کہ وہ خط لکھتے لکھتے مسکراتے۔ آنکھیں اٹھا کر میری
 طرف دیکھا۔ چہرہ الیکم اُحاس ہو گیا۔ ایک گہرا سانس لیا اور بولے۔
 "کیا معز کروں۔ کچھ حالات اور فسادات"

قتہ قتہ انہوں نے بڑی شکل سے میز کی دراز کھولی۔ اس میں سے دس
 دس روپے کے دو نوٹ نکال کر میز پر ہمارے سامنے رکھے۔ انگلی سے ایک نوٹ
 میری طرف بڑھلایا اور دوسرا نوٹ اسی انگلی سے اپنی طرف کھسکایا۔

"دس روپے آپ کے ہیں۔ دس روپے میرے پاس رہتے ہیں۔ اگر
 حالات اور فسادات اجازت دیتے تو"
 کوہا کی ایک لڑکی مجھے بہت خط لکھا کوئی قتی۔ میں رسمی طور پر اسے جواب

دے دیا کرتا تھا۔ میں اس کا اصل نام نہیں کھول سکا۔ آپ اسے غزالہ کہہ لیجیے۔
ابن النشاء کو معلوم تھا۔ ایک روز شام کے وقت ہم دونوں غالباً کراچی کے شیراز
میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ میں نے کہا۔

”یاد غزالہ سے چل کر ملا جلتے۔“

ابن النشاء نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”یاد رکھ۔ قریبے مارے کر قوت میں ریاضہ کو کھو بیجوں گا۔“
میں نے کہا۔

”میں صرف آس لڑکی سے ملنا چاہتا ہوں۔ قریبیں معلوم ہے کہ میرا دل
صاف ہے۔ کم از کم لڑکیوں کے بارے میں۔“

ابن النشاء نے مجھے ہنسا دھکیا لیکن میں اُسے کرغزالہ کے گھر کی طرف
چل پڑا۔ ایک مینی کلکتہ مشائیل کی عمارت تھی جس میں کئی ایک پرانے فلیٹ تھے۔
ایک میز جن اوپر ٹیبلٹوں کو جاتی تھی۔ فبرجھے یاد تھا۔ ہم دونوں ایک فلیٹ کے
دروازے پر جا کر کھڑے ہو گئے۔

”سائے کیوں مروانہ دیتا۔“

”فکر نہ کرو۔“

میں نے دروازے پر دستک دی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک چھوٹے لڑکے
نے دروازہ کھولا۔ میں نے کہا۔

”غزالہ بی بی ہیں؟“

لڑکا دروازہ بند کر کے بھاگ گیا۔ ابن النشاء نے کہا۔

”ابھی وقت ہے بھاگ چلو۔“

اتنے میں اندر سے ایک نسوانی آواز آئی۔

”آپ کہاں سے آئے ہیں؟“

میں نے اپنا نام بتایا تو ایک لمحے کے لیے اندر سے کسی نے کوئی جواب دیا۔

پھر وہی لڑکا دروازہ کھول کر بولا۔

”آجائیں۔“

چھوٹا سا کمرہ تھا۔ پیٹنگ۔ بید کی دو تین کرسیاں۔ کینڈیڈر کا ریس پر ٹھہر ہوا تصویر۔

تپائی پراونٹ کی کھال والا ٹیبل لیپ۔ بیچ میں ایک گول میز۔ کمرے کی فضا
میں مکس صاحب کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ دوسرے کمرے کے غسل خانے سے بالشی
میں پانی گرنے کی آواز آرہی تھی۔ پانی کی آواز بند ہو گئی۔ بید کی کرسیوں پر گرد
کی ٹپکی ٹپکی تہہ جمی تھی۔ ہم نے دھواں نکال کر گرد و صاف کی اور بیٹھ گئے۔ ابن النشاء
نے مجھے اپنی مخصوص اعلو قی گالی دے کر کہا۔

”اگر آس کا باوا لگیا تو کیا کہو گے؟“

میں نے کہا۔

”فکر نہ کرو۔“

کہنے لگا۔

”سائے یہ لاہور نہیں کراچی ہے۔ تم تو پہلے جاؤ گے۔ میں پیچھے لوگیں کو

کیا جواب دیتا پھروں گا؟“

”فکر نہ کرو۔“

اور میں نے گولڈ فلیک کی گولڈن ڈلی کھول کر نہایت خوبصورت سگریٹ
ملگایا۔ دروازے کا ٹیلا پردہ ہٹا۔ وہی لڑکا چائے کا ترے میز پر رکھ کر چلا گیا۔

دو پیالیاں چائے سے بھری تھیں اور ایک ٹیل فٹسری میں خشک میوہ تھا۔ سبز
رنگ کے پٹے خشک انجور دیکھ کر میں نے ابن النشاء سے کہا۔

”مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے کہ میں لبنہ اد کے کسی غلام بدویش ہوں۔“

کا مہمان ہوں۔ پر خشک میوہ۔ یہ چائے کی فہمائان۔“

ابن النشاء نے ناک پر ٹینک ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

”ابھی خشک میوے کا بھاد معلوم ہو جائے گا۔ ذرا اس غلام بدویش

سردار کو کمرے میں آ لینے دو۔
میں نے اُسے آنکھ مار کر کہا۔
"نکرہ کرو۔"

اور پھر آگے ہی آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ایک گھوڑے پر سوار ابن انشاء خرابوں
کے ایٹھریڈو کی تلاش میں سفر کر رہا تھا اور ایک گھوڑے پر سوار میں بھی خرابوں
کے ایٹھریڈو کی کھوج میں تھا۔ یہاں تک کہ سالگرہ کا کارڈ آج بھی میرے پاس ہے،
یہی وجہ ہے کہ مجھے وہ شام یاد رہی جس شام "لورینگز" میں بیٹھ کر مجھے انشاء نے
ایٹھریڈو کی نظم سنائی تھی۔

میں اس نظم کا ہیرو بنا، سفید گھوڑے پر سوار، نیزہ تانے، وادی میں آندھی
بن کر اڑا جا رہا تھا کہ دروازے کا زلزلہ پروہ ایک بار پھر بٹا اور سب سے پہلے
فارول سینٹ کی خوشبو اندر آئی اور اس کے بعد تیز چمکی آنکھوں اور شفات چاندنی
ایسے چہرے والی ہلکی اندر آئی اور سانس والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ کمرے میں غافل
کی خوشبو پھیل گئی۔ یہ غزالہ تھی۔ کم سخن۔ کم آواز۔ کسی وقت نظریں اٹھا کر دیکھتی اور
پھر نظریں جھکا لیتی۔ اس نے ایک بار پھر جانے بنا کر دی۔ ایک بار مجدد احمد نے خیالی
کا ایک شعر سنایا تھا۔ یہ شعر میا سوال کے ایک دیباچہ شاعر نے اپنی محبوبہ کے عشق
کی تعریف میں کہا تھا۔

وہ مکھڑا حیدر باندی دا

بہو کی جن چڑھ پنہا چاندی دا

غزالہ بھی چاندی کا پانہ تھا جس کے چہرے سے شفات کریں جھوٹ رہی تھیں۔
اور مارا کرہ روشن ہو گیا تھا۔ اس روشنی نے انہیں بھی روشن کر دیا تھا۔ اس کی
نگاہوں میں حیا اور پاکیزگی تھی۔ وہ آدھے پورے کراچی میں آتے تھے۔
اودھے پورے۔ نیلی جھیل میں جھللاتے ستاروں کا عکس۔ اور راج محل کے درختوں
سے نکل کر آدھی رات کی خاموشی میں جنگل کی طرف، صحرائی طرف جاتی میرا بانی۔

ہے ری میں تو بہم دیوانی

بہنو انگوڑوں کے درخت، اودھے پورے جھیلوں پر تیرتے سفید کنول اور صحرائی
راووں میں گونجتے میرا بانی کے گیت۔ اور ہرے بھرے بانوں میں کھلا ہوا سفید موتیا۔

جیسے تلخ تھی اور اس میں دارچینی کی ہلکی مٹی جھک بھی تھی۔ اس جھک
نے گولڈ فیک کے فلپور سے مل کر ایک نئی خوشبو کو جنم دیا۔ یہ گرم چٹائی خوشبو
جیسے شرح ریشی دہن بن کر میرے سانسے سے گزر گئی۔ پھر اس خوشبو نے گرم صحرا
کی شام میں مجھے دوسرے دیکھا اور اس کی آنکھیں سرخ یا قوت بن کر چمک رہی تھیں
اور ان آنکھوں میں جیسے دوسرے غروب ہو رہے تھے۔ یہ ایک محرقہ تھا۔ ایک ظلم تھا
جو مجھے ابن انشاء کے موصوفہ و لہذا کی خواب آلود گلیوں میں لے گیا۔ مجھے ایڈگار ایلن
پلو کی نظم ایٹھریڈو یاد آگئی۔ یہ نظم مجھے ابن انشاء نے مارچ ۱۹۵۵ء کی شام کو
"لورینگز" میں سنائی تھی۔ یہ خوبصورت شام مجھے کبھی یاد نہ رہتی اگر اس روز مجھے
ریحانہ کی سالگرہ کا کارڈ نہ ملتا۔ میں بہت خوش تھا۔ اور یہ کارڈ لے کر ابن انشاء کے
گھر گیا تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ آج ریحانہ کی سالگرہ ہے اور اُس نے مجھے کارڈ بھیجا
ہے۔ پھر "لورینگز" میں آگئے۔ ابن انشاء میرے روم میں سے بہت خوش تھا۔ کیونکہ
اُسے معلوم تھا کہ میں ریحانہ سے شادی کرنے والا ہوں۔ کیسی شفات، چمکیلی اور خوشبودار
تھی۔ جیسے جو ہم نے اُس شام "لورینگز" میں بیٹھ کر بنی۔ تانبے کے گولڈن میں یو پکھش
کی چٹنیاں بھی تھیں۔ سالگرہ کا سنہری کارڈ بے داغ میز پر گولڈ فیک کے گولڈن پلیٹ
کے پاس پڑا تھا۔ اور ابن انشاء مجھے ایٹھریڈو کی نظم کے بارے میں باتیں کرنے
لگا۔ ایٹھریڈو ایک شہر ہے۔ خرابوں کا شہر۔ ایک خوبروناخت گھوڑے پر سوار اس
شہر کی تلاش میں گھر سے نکلتے ہیں۔ جنگل، جنگل، قرۃ قرۃ، وادی وادی پھر تانبے۔
جوانی سے بڑھا پا جاتا ہے۔ لیکن خرابوں کا شہر ہر کو کو دکھائی نہیں دیتا۔ پھر ایک
جنگل میں اُسے چمکا ہوا ملبہ ہے جو اسے بتا ہے کہ خرابوں کا شہر ایٹھریڈو۔
چاند کی پھاڑیوں سے اودھ ساریوں کی وادی میں ہے۔ اور انشا گھوڑا آگے بڑھتا ہے۔

گولڈ فیک کا فلور اور چائے کی ملتی ملک۔ ہم مزار کے گھر سے نکل کر سڑک پر آئے تو یوں محسوس ہوا جیسے ہم ایک شہر سے مل کر آ رہے ہیں تاریخ کے اوراق میں سویا ہوا، اندھروں کی وادیوں میں کھویا ہوا شہر۔ جس کے دیوان سکائوں کی منڈیروں پر آکر چاند ٹپک گیا ہے۔

میں نے ابن انشاء کو مجھدا کانا یا ہوا یا بجائی کا شعر سنایا تو کہنے لگا۔
”چاند گاؤں میں بھی سفر کرتا ہے۔“

چاند کراچی کی سڑکوں پر بھی اُس رات ہمارے ساتھ ساتھ سفر کر رہا تھا۔ جہاں گھر روڈ والے مکان پر آکر ہم دیر تک مزار کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ اس تیز چمکیں آنکھوں اور شفاف چاندی ایسے چہرے والی لڑکی نے مجھے خوشبو اور پاکیزگی کا احساس دیا تھا۔ رات کو مجھے اپنے بستر پر بڑی گہری خوشبو آتی جیسے موتیے کا سفید بھول ماسٹ لینا میرے قریب سے گزر گیا ہو۔ ایک جنگ میت گیا ہے اس بات کو۔ اودھ لڑکی میرا ہاتھ پیر کی پھرتا تھا نہ ہو سکی۔ نیلی جھیل میں کھلے اس دودھیا کول کے پھر درجن نہ ہوتے۔ آج بھی جب کبھی اس کا خیال آتا ہے تو موتیے کے گہرے کی دھیمی دھیمی سی ملک آتی ہے جو کسی دہن کی کلائی سے پھیل کر فرش پر گر پڑا ہو۔

مجھے روز کراچی میں ٹھہرنے کے بعد میں لاہور کی طرف روانہ ہوا۔

لاہور بہت یاد آئے لگا تھا۔ ابن انشاء دیلوے سٹیٹن ملک میرے ساتھ آیا۔ اس کا ایک ترجمہ کیا ہوا مسودہ لاہور میں کسی پبلشر کو دینا تھا۔ وہ مجھے بار بار تاکید کر رہا تھا۔

”تم لاہوری اور میرے دار آدمی ہو۔ متو دے کو سنبھال کر لے جانا اور

جاتے ہی پبلشر کے حوالے کر دینا۔“

انجمن نے سٹیٹن بجائی۔ ان دنوں سیٹی والے دیلوے انجمن چلا کرتے تھے۔ بڑا شور مچاتے۔ بڑا دھواں چھوڑتے۔ بڑی راکھ اڑاتے۔ کراچی سے لاہور

اور لاہور سے کراچی پہنچنے والا سافر بہت تنگ جانا تھا۔ ریل گاڑی چل پڑی، ابن انشاء پلٹ فارم پر کھڑا ہوا تاکہ جانا رہا۔ میں ڈبے کے دروازے میں کھڑا آئے دیکھتا رہا اور ہاتھ دلاتا رہا۔ پھر وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

میری شادی پر ابن انشاء نہ آ سکا۔ وہ ملک سے باہر گیا ہوا تھا۔ اس کی جہان گردی شروع ہو چکی تھی۔ وطن واپس آیا تو مجھے کراچی سے مبارکبادی کا خط لکھا۔ کچھ دنوں بعد اس کا لاہور آنا ہوا تو میرے ٹیلیٹ روڈ والے مکان پر آیا۔ وہاں نالا لگتا تھا۔ معلوم ہوا کہ میں اپنے سسرال کو بھی دروازہ گیا ہوا ہوں۔ سید صاحبی دروازے والے مکان پر آ گیا۔ مجھ سے بغلیں ہو کر ملا اور شرارت بھری آنکھوں سے مسکراتا ہوا ہولا۔

”کیٹنے! آشر ٹوٹے بے چاری بھولی بھالی ریجان کو مچھاس ہی لیا۔“
میں نے پوچھا۔

”کیا کچھ کیا پیڑھے؟“

”بھئی پسے ہیں گے پھر کھائیں گے؟“

ابن انشاء کھانے پینے کی باتیں بہت کرتا تھا سگر کھاتا بہت کم تھا اور وہ بھی کوئی خاص رحبت کے ساتھ نہیں، بہر حال اسی وقت بازار سے قہیے والا آتھرا اور لال کھوہ سے مشہور باداموں والی برنی منگوائی گئی حسب عادت انشاء نے تھوڑا سا تھرا اور برنی کی ایک آدھ ڈلی کھائی۔ ریجان نے کہا۔
”بجائی جان اگر آپ نہیں کھائیں گے تو یہ سب کچھ آپ کو ساتھ لے جانا پڑے گا۔“

ابن انشاء ہنسا۔

”یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ میں ڈر گیا تھا کہ تم کہو گی۔ اگر آپ کھا لیں

گے نہیں تو میں یہ سب کچھ سامنے سے اٹھا لوں گی۔“

اس نے ریجان کو اکادون روپے نہ سلائی کے دینے اور مجھے ایک چیک انگلش

لال اس سڑک کے ساتھ دی گریں اسے اس کے جانے کے بعد باندھوں گا ثانی
آتی خوبصورت تھی کہ میں نے اسی وقت باندھ لی۔ ابن اثنا۔ نہیں کہہ سکتے تھے۔
"اچھا تو تم یہ چاہتے ہو کہ میں چلا جاؤں؟"

میں نے اسے اپنے ساتھ لٹایا۔ ابن اثنا کی دی ہوئی ثانی آج میرے
پاس نہیں ہے۔ خدا جانے کہاں چلی گئی ہے۔ ابن اثنا بھی آج میرے پاس
نہیں ہے۔ خدا جانے کہاں چلا گیا ہے۔

پاکستان رائٹر گلڈ کا پہلا اجلاس ہو تو کراچی میں ابن اثنا سے پھر ملاقات
ہوئی۔ اجلاس خالد دینا ہال میں ہو رہے تھے۔ پاکستان رائٹر گلڈ کی بنیاد رکھی
جاری تھی۔ تھتہ اللہ شہاب اور جلیل الدین عالی کی مشابہت روز بھینس بار آور ہو
رہی تھیں۔ شہر شہر گاؤں گاؤں سے ادیب آکر میج ہوئے تھے۔ میرا زیادہ وقت
ابن اثنا کے ساتھ گزرتا تھا۔ ہم گلڈ کے جلسوں میں بھی شریک ہوتے اور کراچی
شہر کی لمبی لمبی سیریں بھی کرتے۔

"اے عہد کراچی مجھے بہت پسند ہے۔ بس ایک بات کی کمی ہے۔ یہاں
لاہور کی گلیاں نہیں ہیں۔"

لاہور کی گلیاں ابن اثنا کو بہت یاد آتی تھیں۔ پیرس، ٹوکيو، روم اور
نیویارک جا کر بھی وہ لاہور کی گلیوں کو نہیں بھولتا تھا۔ لاہور کی بڑا سر لکھوں
کا آسپ اس ملک ملک کا نشانہ کرتا رہا۔ کئی بار ایسا ہو کہ گلڈ کا اجلاس ہو رہا
ہے۔ ادیبوں اور شہزادوں کے مستقبل پر غور ہو رہا ہے۔ بزرگ اور فقہ قسم کے
لوگ بیٹھے ہیں۔ ابن اثنا بڑی سنجیدگی کے ساتھ کسی نکتے پر بحث کر رہا ہے کہ
اچانک ہلکی نفیس چادر ہو گئیں۔ پھر بغیر کسی وجہ کے ہمیں ہنسی کا ایک جھٹکا سا
لگا۔ ادیب ہم اپنی اپنی ہنسی کو روکنے کے لیے ایک دوسرے سے آنکھیں چرا
رہے ہیں۔ ہنسی کا زور اچھل اچھل کر اندر سے نکلنے کی کوشش کر رہا ہے اور ہم
اسے دبا رہے ہیں۔ دونوں اس کوشش میں ہیں کہ آنکھیں چادر نہ ہونے پائیں کیونکہ

پھر ہنسی کو روکنے کے لیے اب اس سے روکنے کے برابر والی بات ہو جائے۔ ایک
دفعہ ابن اثنا سے ضبط نہ ہو سکا اٹھ کر باہر چلا گیا۔ میں بھی نہ چھپا تا ہنسی
کو روکتا باہر آ گیا۔ اور پھر ہم کسی کونے میں بیٹھ پکڑے پتلے تو خوب ہنسے،
پھر ایک دوسرے کو دیکھا۔ آنکھیں رومال سے صاف کیں اور ابن اثنا نے
ہینک کے شیشوں پر رومال پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"یار! ہم ہنسے کس بات پر رہے؟"

پھر وہ مجھے سرزنش کرتے ہوئے کہتا۔

"کیسے! خیر وار اگر پھر مجھے ہنسائے کی کوشش کی۔ تم ابھی تک وہی

لاہور والے غمزہ دار کھنڈر سے ہو اور میں اب میاں بڑا
مدتہ آدمی ہو گیا ہوں۔"

لیکن جو بڑی وہ کسی روشندان یا کھوکری پر کسی چڑیا کو بیٹھے چوچے ملاتے
دیکھتا تو سب کی نظر میں بھا کر مجھے مزہ دے دیکھتا اور پھر ہمارے چہرے لال ہونا
شروع ہو جاتے، ایک انجانی مگر بڑی زبردست خوشی سے۔

لاہور میں ابن اثنا کے مکان کے باہر جو پمیل کا درخت تھا، اس پر
کسی چڑیا نے گھونسہ نہالیا۔ اتفاق سے چڑیا کا بڑے نیچے آنکلی میں آگرا۔ ہم نے
اسے اٹھا کر نہالیا۔ روٹی سے اس کے منہ میں چائے کے قطرے پٹکائے اور گلاب
کی جھاڑیوں میں اسے ایک جگہ گتے کے چھوٹے سے ڈبے میں لٹا کر دکھ دیا۔
ابن اثنا نے کہا

"ارے اسے تو قی کیا جائے گی۔"

پھر ہم اسے اٹھا کر اندر لے گئے اور اثنا نے ڈبہ اس طاق کے اوپر رکھ
دیا جس میں اس کی گنگنی شیشہ اور شیو کا سامان پڑا رہتا تھا۔ ہم روز چڑیا کے
بٹکے کو دودھ ملاتے۔ پھر اسے کی چھوٹی چھوٹی گولیاں بنا کر اسے کھلائے گئے۔
مادہ دلوں کے بعد چڑیا کے بچے کے پرنکل آئے اور پھر ایک روز ہم اسے لے

کی ٹھیکوں گلیوں ہوتا سیدھا ایٹ روڈ ابن انشاء کے مکان پر پہنچا۔ اُسے لطیفہ سنایا تو ہنستے ہنستے وہ بھی بے حال ہو گیا۔ میں نے کہا۔

”اس لطیفے کی خوشی میں آج پلازا سینما والی فلم دیکھ لینی چاہیے۔“

ابن انشاء نے کہا۔

”سارے پیسے کہاں سے آئیں گے؟“

میں نے کچھ سوچ کر کہا۔

”فلم میرے ساتھ آؤ۔ سب انتظام ہو جائے گا۔“

اس وقت دن کا ایک بجنا تھا شاید۔ ابھی فلم شروع ہونے میں تین گھنٹے

باقی تھے۔ میں اُسے لے کر لوہاری دروازے ادب لطیف، مکے دفتر میں آ گیا۔

ان دنوں مرزا ادیب ایڈیٹر تھے۔ دفتر کی میز جیوں میں روک کر ابن انشاء نے

مجھ سے پوچھا کہ میرے ذہن میں سکیم کیا ہے۔

”اگر متاثر یہ خیال ہے کہ ادب لطیف، مکے دفتر سے پیسے مل جائیں

گئے تو یہ وہم دل سے نکال دو۔“

میں نے کہا۔

”میں جانتا ہوں کہ میں چیل کے گھونسلے میں جا رہا ہوں۔ لیکن تم یقین

کر میں آج اس ادب لطیف، کی چیل کو کیسے بھون کر کھا جاتا ہوں۔“

اوپر آئے تو میرزا صاحب بیٹھے کچھ مکھ رہے تھے۔ حسبِ عادت تھیں دیکھ

کہ بڑی خوف زدہ سکرامٹ کے ساتھ ملے۔ ادھر ادھر کی باتیں شروع ہو گئیں۔

میں نے اپنی سکیم پر عمل شروع کرتے ہوئے کہا۔

”میرزا صاحب کیا خیال ہے اگر اس سال کے بہترین ادب کا انتخاب

میں اور ابن انشاء کو کریں۔“

مرزا صاحب ٹھوڑی بکھی نے گئے۔ مکتبہ اردو کی طرف سے اُن دنوں ہر سال

کا بہترین شعری اور نثری انتخاب کئی صورت میں چھپا کرتا تھا جسے مختلف ادیب

کر لائن باغ آگئے۔ یہاں میں نے اُسے ہاتھ پر بٹھا کر زور سے اوپر ہوا میں

اچھال دیا۔ چڑیا کا بچہ ٹھوڑا سا اڑا اور پھر گھاس پر گر پڑا۔ انشاء بولا۔

”یاد رہی اسے اڑنا نہیں آیا۔ واپس گھرے چلتے ہیں۔“

”ارے نہیں۔ تین چار بار اسی طرح ہوا میں اچھالیں گے تو یہ خود بخود اڑ

جائے گا۔ تم دیکھتے رہو۔“

پھر ہم نے باری باری چڑیا کے بچے کو ہوا میں اچھالنا شروع کر دیا۔ چھ

سات بار گھاس پر گرنے کے بعد وہ ہوا میں جھکولا سارے کر اوپر کواٹھا اور

اٹھاس کے درخت پر جا کر بیٹھ گیا۔ ہم ہنسے فوش ہوتے اور درخت کے نیچے

کھڑے ہو کر مڑاٹھلے اُسے ٹکنے لگے۔ پھر ہم نے اُسے ہاتھ ہلا کر الوداع کہا۔

اور واپس چل دیے۔

۱۹۵۲ء میں لاہور سے ایک ہفتہ وار رسالہ ”احساس“ چھپا کرتا تھا۔ اس

پرچے کے ادارہ قریب میں عباس احمد عباسی، حمید الہ اور الہ جلال شامل تھے۔

ہیڈ کاتب صاحب کے پاس باہر کے ٹی ٹال کے مالک بھی کھرا کر بیٹھتے تھے۔

یہ صاحب کبڑے تھے۔ ایک دفعہ ڈاکر نے کہ وہ بڑی سخت گھری پڑ رہی تھی

میں الہ جلال کے پاس بیٹھا کوئی رسالہ دیکھ رہا تھا۔ ہیڈ کاتب کے پاس وہی

گھڑے صاحب بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے۔ وہ ابھی ابھی کھانا کھا کر

آئے تھے اور ادھر رہے تھے۔ پھر وہ اچانک اٹھ کر چل پڑے۔ ہیڈ کاتب نے

پوچھا۔

”کہاں چلے؟“

”گھڑے صاحب کے مزے بوجھتے نکل گیا۔“

”ذرا کم سیدھی حرکت ہے جا رہا ہوں۔“

میں اور الہ جلال ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اتنا اچھا

لطیفہ ہو جائے اور ابن انشاء کو خبر نہ ہو۔ میں اس دھوپ میں باہر نکل اور وہ

شاعر اور نقاد حضرات مرتب کرتے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ سرفراز کا انتخاب ابھی شائع نہیں ہوا اور سرفراز میرزا صاحب ہوئے۔

”یہی خوشی کی بات ہے۔ میں آج ہی چوہدری برکت علی صاحب سے بات کرتا ہوں۔“

”اُن سے میں نے بات کر لی ہے میرزا صاحب!۔
”بس تو پھر دیکھ کس بات کی ہے۔ ہم اللہ کر دی۔“

میں نے چوہدری صاحب سے کوئی بات نہیں کی تھی اور ان سے بات کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ابن الیاء بامبار میری طرف دیکھ رہا تھا اور سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ملا زائینا والی فلم کے ساتھ سرفراز کے بہترین ادب کے انتخاب کا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ میں نے ابن الیاء کی طرف دیکھ کر کہا۔

”بس ابھی انشاء اللہ نظم کا حصہ سمجھا لو۔ میں افسانے کا انتخاب کرتا ہوں۔“

”کام آج ہی سے، بلکہ ابھی سے شروع ہو جانا چاہیے۔“

پھر میں نے میرزا صاحب کی طرف دیکھ کر بڑا پکاسنا کر کہا۔

”اب آپ ایسا کریں کہ میں ہندوستان اور پاکستان کے ادبی پرچے

مناہٹ کر دوں تاکہ انہیں پڑھ کر ہم انتخاب پر کام شروع کر دیں۔“

مجھے معلوم تھا کہ ادب لطیف کے دفتر کے ایک کمرے میں ہر قسم کے ادبی رسالوں کا انبار لگا رہتا ہے۔ میرزا صاحب ہوئے۔

”بھئی اندر جا کر اپنی مرضی کے رسالے چن لیں۔“

ہم ساتھ والی کونٹری میں آگئے۔ ابن الیاء اندر آتے ہی بولا۔

”کم بخت! یہ کیا محبت مول لے رہے ہو؟ ان رسالوں کو کون پڑھے گا؟“

میں نے کہا۔

”ش! خاموش رہو اور دیکھتے جاؤ۔“

میں نے یونٹی ادھر ادھر سے پنجابی گورنمنٹی ہندی وغیرہ کے رسالے اٹھا

کر اُن کا گٹھا بنایا اور باہر لے آیا۔ میرزا ادیب نے ہندی گورنمنٹی رسالے دیکھ کر حیران سے پوچھا۔

”مولانا! یہ رسالے کون پڑھے گا؟“

میں نے کہا۔

”میرزا صاحب! میں بڑی ایمانداری کے ساتھ ادبی نگارشات کا انتخاب

کرنا چاہتا ہوں۔ میرے ایک دوست ہندی گورنمنٹی پڑھنا جانتے ہیں

چاہے مجھے ساری رات جاگنا پڑے لیکن میں اُن صاحب کے پاس بیٹھ

کر ان رسالوں میں چھپے ہوئے افسانوں کا ایک ایک لفظ سنوں گا۔“

اور پھر انتخاب کر دوں گا؟

میرزا صاحب! میرے اس مجاہدانہ عزم پر بڑے خوش ہوئے کہنے لگے۔

”پھر تو میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اس بار کا انتخاب بہترین

ہو گا۔“

”انشاء اللہ؟“

اور ہم دونوں رسالوں کے دو گٹھے لے کر ادب لطیف کے دفتر سے بیچے اُتر

آئے۔ میرزا صاحب نے بہت امر کیا کہ ابھی پیراسی آ جاتا ہے وہ خود اٹھ کر آئے

میں رکھوا دے گا، لیکن میں نے کہا کہ یہ ادب کی خدمت ہے۔ اسے ہم اکیلے ہی

کرنا چاہتے ہیں۔ بازار میں آئے تو ابن الیاء نے قہقہہ کا انہار کرتے ہوئے کہا۔

”ان گناہ کی محفروں کو کہاں سے جانے گا؟“

میں نے اُٹھ مارتے ہوئے کہا۔

”ابھی ادب کی خدمت کرتے ہیں۔ پیراسی رہو اور میرے پیچھے چلے آؤ۔“

میرزا صاحب ابن الیاء کے گٹھے میں دھکے دے رہے تھے اور میرے گٹھے میں ہتھ

میں سرگردو کر اس کر کے موری گیٹ کے باہر آ گیا۔ یہاں سے بدر کی طرف ہو گیا۔

ابن الیاء، میرے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ یہاں روی فرید نے والوں کی بے شمار کانٹیل بددی

کے ساتھ ساتھ لوہاری گیٹ ٹکسہ چلی گئی تھیں۔ یہ بول بیل رڈی خریدتے تھے۔ باہر اسلامی ترازو لگے تھے اور کالوں میں رڈی اخباروں رسالوں کا بیروں اور کاغذوں کے انبار لگے تھے۔ میں نے ابن الشام کو آٹھ ماری اور ہم نے دونوں گھٹے ایک دکاندار کے آگے دکھ دیے۔

”رسالوں کی رڈی آپ کیا بھاؤ لیتے ہیں؟“

اب ابن الشام سمجھ گیا تھا کہ ہم شہر کے بہترین ادب کا انتخاب کس طرح کرنا چاہتے ہیں۔ اس زمانے میں وہ رسالے رڈی کے بھاؤ کو فی پندرہ روپوں میں کیے۔ روپے جیب میں ڈال، بہترین ادب کا انتخاب کر کے کیم بدرو کے کنارے شاہ عالی دروازے کی طرف نکل گئے۔ یہاں سے ہم نے تانگر کرایا اور سیدھا چلا زاسنا آگئے۔ جہاں بورس کاروف کی ڈراؤنی فلم لگی ہوئی تھی۔ ابن الشام بستے ہوئے کہنے لگا۔

”ابا انتخاب تو ہم ہر جینے کو سکتے ہیں۔“

میں نے کہا۔

”میں ہر روز کرنے کو تیار ہوں۔“

ابن الشام نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”اسے کہتے ہیں بہترین انتخاب۔ مگر یاد بعض رسالے بڑے قیمتی تھے اور

باکل تازہ۔“

میں نے کہا۔

”ارے فلم بھی تو دیکھو کس کی لگی ہے۔ بورس کاروف۔ اور پھر قداؤنی۔

بیسٹ ناک۔ جیو ٹکٹ لیتے ہیں۔“



پیشکش: محترمہ سر سیدہ بیگم اور سیدہ امینہ بیگم کے ساتھ ابن الشام کی شام کو حلقہ زار میں ایک قافلوں کے ساتھ



لے حمید اور مصطفیٰ حسین
(پاک فوج کے افسر)



(پہلے قلعہ میں کمرے ہوتے تھے وہاں سے اپنے)
حسن طاہر، شریف، کنہاسی۔ عید اللہ ملک۔ میر اختر، اکرم انکار۔ جیلے ملک
(پہلے جیسے دور کے قلعہ)
طفیل، مرغان۔ عید اللہ، عید اللہ، احمد، عید اللہ، عید اللہ
(پہلے جیسے دور کے قلعہ میں)
لے حمید۔ احمد، عید اللہ۔ قلعہ شہانہ

(یہاں جناح میں چھوٹی برکت علی ملک، کتبہ، عید اللہ کی جانب سے دیکھی گئی ایک دولت میں)



(دائیں سے بائیں کھڑے ہوتے)
 حسن طاہر، علامہ عیسیٰ عقیل شافعی، جیل ملک، اکرم افکار
 (بٹھے ہوئے دائیں سے بائیں)
 احمد راجہ، احمد علی تھانی، مولانا چارغ حسن حسرت، عبداللہ بیٹا، مولانا
 صلاح الدین احمد اور اسے جیل
 (جلد سے لڑکتے ملتے مالک کتبہ اردو کی لکھنؤ کے موقع پر پرنٹنگ میں)



مولانا کوٹلی، حسن احمد، علامہ شافعی، ملے جیل



(دائیں سے بائیں) اے جید۔ طیفیل احمد خاں۔ محمد صفدر میر۔
 احمد راجی۔ عبدالرشید ملک۔ فیض احمد فیض۔
 حمید اختر۔ احمد ندیم قاسمی۔ ایوان سید۔
 عبدالجبار بھٹی۔ عارف عبدالعزیز احمد۔ جباری ظہیر۔
 (سویڈا کی دعوت پر - یانچ جناح)



(ساہوکار خانہ کی چٹائی پر کھڑے ہو کر لی گئی) اسٹوڈنٹ احمد راجی۔ عبدالعزیز عارف۔
 (چٹائی پر کھڑے ہو کر لی گئی)



میرزا محمد علی



انجمن (میرزا محمد علی) - اے جید - شہرت بخاری
میرزا محمد علی



(دائیں سے بائیں اگلی قطار) - عبدالجید صبیحی - احمد راجی - طفیل احمد عثمان - نعیمہ کشمیری -
 نور صفدر میر - عارف عبدالستار -
 (پچھلی قطار) - ابراہیم مجلس - حمید اختر - سید ایوب کریمانی - عبداللہ ملک -
 احمد نذیر - قاسمی احمد لکے حمید -
 (انٹرجاز میں سویرا کی طرف سے دی گئی ایک دعوت کے بعد)

جاری شدہ ۱۹۸۵ء

حیرانہ

قاریف



پرنس روڈ - کراچی - ۱

دیارے !

شکایت دے! اعلاؤ بیڑے -

آزتم اف سزا یا سفرنا بینی بیکرگ

تو نہ رازہ خط جہانے کو دے دوں گا -

اس میں جو کالیاں ہیں وہ بھی ہیں

کاڑا تہ - ہتھاری قلنی کھل جاتے گی -

پس - جاننا : ہتھارا

و ہتھارا

صدر ایجنسی
 کے رکن
 سرکاری سمیت
 شریک پاکستان کے
 واسطے جو
 سرکاری دفتروں میں
 ایک نام
 ۴۴ بڑی سے
 ۴۸ بڑی تک
 ڈاکٹر
 (پچھلے برس)
 عہدہ سربراہ
 اپنے افسر



رائنڈنگ کے اجلاس ختم ہوئے اور میں کراچی سے لاہور روانہ ہوا۔
 ابن انشاء مجھے چھوڑنے ریلوے سٹیشن تک آیا۔ ابھی گاڑی چلنے میں کچھ وقت
 تھا۔ ہم ایک سال پر کھڑے ہو کر چائے پیتے گئے۔ ابن انشاء کی جدوجہد کراچی میں
 بھی جاری تھی، لیکن اسے لاہور میں گزارنے کے لئے دن بہت یاد آ رہے تھے۔ وہ
 بار بار مجھ سے لاہور کے دوستوں، لاہور کی گلیوں، لاہور کے باغوں اور رہنماؤں
 پاک بن باؤس، انڈیا کافی ہاؤس، اور لارنس باغ کے امتاس کے درخت کے بارے
 میں پوچھ رہا تھا۔ کیا بس لہجہ اب بھی میٹرو پول میں ڈائن کرتے ہیں اور لوگ
 چائے کی پیٹریوں میں بادہ اٹھارے سے شغل کرتے ہیں؟ کیا پاک بن ہاؤس میں پوٹوں
 کے جھلنے اسی طرح لگتے ہیں؟ حمد اشرف کیا کرتا ہے؟ لارنس باغ کے امتاس کے
 درخت پر زرد پھولوں کے گچھے اسی طرح خوشبو میں اڑاتے ہیں؟ بسط صحن کے
 پائپ کیا حال ہے؟ چوہدری نذیر اسی طرح تم لوگوں کو گریڈ اور پھلی کھاتے ہیں؟
 ملک وید بر سر پیر، چوہدری نذیر کو کھانے اور کھانے کا بہت شوق تھا۔ وہ مجھ
 سے افسانوی اور ابن انشاء سے خاص طور پر بہت پیار کرتے تھے۔ یہیں خاص
 طور پر گریڈ کھانے اپنے بھائی دروازے والے گھر لے جاتے۔ ان کے ہاں مقرب
 کا گریڈ پکنا تھا۔ دودھ ایسا مستقا اور خاص ہوتا تھا کہ جیسے پیر کا نکالا گیا ہو۔

پستے بادام تو گویا خاص طور پر کثیر سے منگوائے جاتے اور سب سے خوبتر اور حوصلہ افزا بات یہ تھی کہ چوہری صاحب سانسے بیٹھ کر نہیں کھاتے۔
 "یار حمید یہ بھی کھاؤ۔ یار راہی وہ بھی کھاؤ۔ ابن انشاء یہ
 بادام بھی چکھو۔ خالص کاغذی ہیں۔ اگر تم روزانہ میرے پاس
 آکر یہ کھانا کھاؤ تو خدا کی قسم دو ہفتے بعد تمہاری عینک اتر جائے"
 ابن انشاء مسکرا کر کہتا۔

"چوہری صاحب! اگر میری عینک اتر گئی تو میں بگڑا کیسے
 دیکھ سکوں گا؟"

احمد راہی ہنس کر کہتا۔

"پھر تمہیں ہر طرف بگڑا ہی بگڑا نظر آئے گا۔"

ایک بار چوہری صاحب نے خاص طور پر ہمارے لیے گھر پر پھیلی ہوئی
 ایسی پھیلی میں نے پھر کسی نہیں کائی۔ چوہری صاحب نے چھپکی کی ایک گھٹی
 کے اوپر سے تلی ہوئی چربی انار کو میرے تان پر رکھتے ہوئے کہا۔
 "اسے کھاؤ اسے حمید۔ بس کارڈیو رائل ہی ہے۔"

ایک روز میں اور ابن انشاء حسب معمول سویرا کے دفتر گئے تو معلوم ہوا
 کہ مشہور افسانہ نگار عزیز احمد آتے ہوئے ہیں اور ابھی ابھی "ادب لطیف"
 کے دفتر میں گئے ہیں۔ حال ہی میں ان کی کتابیں "زریں تاج" اور "مدن سینا"
 اور صدایاں "پچھی تھیں۔ جو ادبی حلقوں میں بحث کا موضوع بنی ہوئی تھیں۔ ان
 کے ناول "مگرچہ" کی ہم لوگوں میں بڑی دھوم مچی وہ اپنی لڑکا بڑا مزے دار
 مفر نامہ تھا۔ ہم ادب لطیف کے دفتر میں گئے۔ عزیز احمد سے ملے۔ انھوں
 نے کہا۔

"مجھے ذرا ہیں انار کھلی کی سیر کراؤ۔"

انار کھلی کی سیر ہم سارا دن ہی کرتے رہتے تھے۔ لوہاری دروازے سے

کبھی خوب صورت لڑکی کی تعریف کرتے انار کھلی میں داخل ہوتے اور نیلا گنبد پرست
 کو بھر کبھی خوب صورت لڑکی کا نقاب کرتے واپس لوہاری دروازے آجاتے۔
 معلوم ہوا کہ عزیز احمد کو لڑکیوں سے دلچسپی صرف ناول کی حد تک ہے جب کہ
 ہم ناول تک آتے آتے لڑکیوں کو پیچھے چھوڑ دیتے تھے۔ ہم نے انھیں
 انار کھلی کی خوب سیر کرائی ایک جگہ علوان کی دوکان دیکھ کر بولے۔

"جتنی ہم جب بھی لاہور آتے ہیں ہوتی ضرور پیتے ہیں میرا خیال

ہے کہ ایک ایک گلاس لسی کا ہونا چاہیے۔"

ہم نے ایک ایک گلاس لسی کا پیا۔ عزیز احمد بڑے خوش ہوتے۔ ابن انشاء
 کہنے لگا۔

"آپ اگر ہم پاک ٹی ہاؤس جا کر چائے کی پوری چٹپٹک بھی پی جائیں
 تو اس کی ٹھنکی اثر ہمیں کر سکتی۔"

ابن انشاء کو چائے کی ٹھنکی کا بڑا خیال رہتا تھا شاید اسی لیے وہ دہرہ کر
 کھی شکر کھانے کے بعد ضرور کھایا کرتا۔ ہم پاک ٹی ہاؤس آگئے۔ یہاں دوسرے
 کئی ادیبوں اور شاعروں سے عزیز احمد کی ملاقات ہو گئی۔ چائے کے دور
 چلنے لگے۔ ٹی ہاؤس کی دفنایں روشنی ہنگ اور شب کی گرجوٹی پیدا ہو گئی۔
 اس دفنایں کبھی کبھی انور جلال کے چوہنکا دینے والے تھپتے گونج
 جلتے۔ پاک ٹی ہاؤس میں داخل ہونے کے بعد وقت کی رفتار شاید عزم جاتی
 تھی۔ میں چٹائی نہ چلا اور باہر رات ہی ہو گئی۔ عزیز احمد سواری لے کر خدمت
 ہو گئے۔ گواچی ایپسری نے سینی دی تو ہم چونکے۔

"ارستہ اکم بخت تیری گاڑی چلنے والی ہے۔ جلدی کرو۔"

ابن انشاء نے کہا میں ڈپتے میں گھس کر اپنی سیٹ پر کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔

"یار انشاء! ابھی جی نہیں بھرا۔ دل تو ابھی چاہتا ہے کہ تیرے

پاک کھولوں اور ٹھہرتا۔"

انشار بہت بڑا۔

”اسی لیے تو میں پیشین حکم تیرے ساتھ آیا ہوں۔“

”کیا مطلب؟“

وہ ہنسا۔

”مطلب یہ کہ میں قتاری عزت افزائی کے لیے تھوڑا بیاں بک

آیا ہوں۔ میں تو یہ دیکھنے آیا ہوں کہ تو جاتا ہے کہ نہیں۔“

ٹرین پل پڑی اور ابن انشار کا ہنستا مسکراتا چہرہ بھیڑ میں گم ہو گیا۔ ٹرین چھوٹے

چومے نشین چھوڑتی، دھواں اور گرد اڑاتی لاہور کی طرف اڑی چلی جا رہی

تھی اور بچے ابن انشار کی باتیں، اُس کے ساتھ گزارے ہوئے لمحے یاد آ رہے

تھے۔ ابن انشار کے لاہور سے چلے جانے سے میرا ساتھی مجھ سے بکھر گیا تھا

ایک ایسا ساتھی — جو میرا ہم راہ تھا۔ ہم خیال تھا۔ ابن انشار لاہور میں

ایشی خوبصورت یادوں کے ایسے درخت چھوڑ گیا جن پر خوں کے موسم میں

میں بھول بھٹکتے تھے اور میں ان پھولوں کی خوشبوؤں میں انشار کو یاد کیا کرتا

تھا۔ اب تو ابن انشار کو اپنی ہی مٹی نہیں ہے۔ دنیا کے کسی شہر میں نہیں ہے

اور اب اُس کی یادوں کے درختوں پر بھول مڑھانے لگے ہیں اور شاخوں

کے پتے زور دہو کر سارا سال گرتے رہتے ہیں اور میں ان مڑھاتے پھولوں

اور گرتے پتوں میں بیٹھا اپنے انشار کو یاد کرتا رہتا ہوں کبھی وقت اس کے

حقے کی آواز آتی ہے۔ چونک کر چاروں طرف دیکھتا ہوں۔ کوئی بھی نہیں

ہوتا۔

زور دیتے نیچے گرنے لگتے ہیں۔ درختوں کے زرد انشور!

سویرا کی جانب سے لاہور کے لارنس باغ میں ترقی پسند مصنفین کو

ایک دعوت دی گئی۔ اس میں فیض احمد فیض، احمد ندیم شامی، عبدالجبار سبکی

سبط حسن، ابراہیم ملیس، صفدر میر، حمید اختر، عبداللہ ملک، شرافت کنجاہی،

احمد ربانی، ابن انشار، الوب کرمانی، تقیل شفاقی، مولانا صلاح الدین احمد،

مولانا چراغ حسن حسرت، امیر اادیب، قدیم نظر، یوسف شہر تنویر نقوی،

غیر کا شیری، حسن طاہر، جلیل ملک اور میں نے شرکت کی۔ لارنس باغ کے

گلستان فاطمہ کی اُن دونوں نئی نئی تزئین ہوئی تھی۔ اس یادگار تقریب کے

گرد پ فوٹو آج بھی میرے پاس ہیں۔ یہ آج سے چوبیس برس پہلے کی تصویریں

ہیں۔ لوگ پہچانے نہیں جاتے۔ ان تصویروں میں نہ صرف یہ کہ لوگوں کے

بال کالے ہیں بلکہ موجود ہیں۔ جوان، تروتازہ، زندگی سے بھرپور شگفتہ چہرے ہیں۔

اب ان لوگوں کو دیکھتا ہوں تو یقین نہیں آتا کہ یہ وہی لوگ ہیں جو چوبیس برس

پہلے لارنس باغ میں گلستان فاطمہ میں جٹ تھے۔

چوہدری نذرتے بڑا اہتمام کر رکھا تھا۔ ایک میزنی کے علاوہ ہنر سے

بہترین قسم کی مصفا کی بھی تنگوائی تھی۔ اوپن ایر کیفے کے باغ میں میز چوڑے

کرسیاں لگا دی گئی تھیں۔ چائے کا ذکر شروع ہوا۔ گویا ملک واپس آ گیا۔

ایسے ایسے بیٹھے ہوتے ایسی ایسی باتیں ہوئیں کہ حسرت ہوتی ہے کہ کاش اس

زمانے میں انھیں کوئی ٹیپ کر لیتا۔ ابن انشار کے دانت میں درد تھا جلد فخر

نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”انشار! یہ ہمارے تھار سے کھانے کے دانت میں درد ہے یا

دکھانے کے دانت میں؟“

ابن انشار نے ایک ہاتھ سر پہ بوتے گال پر دھک کر کہا۔

”کھانے کے دانت ہیں۔“

سبط حسن نے کہا

”بھئی انشار! اب اس دانت کو کیوں نہیں نکھو ادیتے؟“

حمید اختر نے کہا

”اگر میرا دانت ہوتا تو فوراً نکھو ادیتا۔“

ابن انشا بولا۔

”میں بھی جھکوا دیتا اگر یہ تیرا دانت ہوتا۔“

لاہور کے ایک سیلانی فولگا مر حنیف قندھاری نے اس گروپ کی تصویریں
 اتاریں۔ حنیف قندھاری بڑے ماہر فولگا مر ہیں۔ ان کی سب سے بڑی غزلی یہ
 ہے کہ وہ تصویر اتار لیتے ہیں مگر دیتے نہیں۔ لاہور کے ایک نوجوان شاعر
 نے ان سے ایک تصویر بنوائی۔ حنیف قندھاری سے ملاقات ہوئی تو
 نوجوان شاعر نے تصویر مانگی۔ حنیف نے کہا۔ ”اے بیٹا یا! اتنی جلدی بھی کیا ہے
 اب نوجوان شاعر نے حنیف کے پیچھے پیچھے پھرنا شروع کر دیا۔ لیکن حنیف غائب
 ہو گیا۔ پھر میں ہی غائب ہو گیا۔ اس میں یہ خلی بھی تھی کہ وہ سڑک پر پھٹے چلتے
 غائب ہو جاتا تھا۔ ابھی پاک ٹی ہاؤس میں بیٹھا جانتے ہی رہا ہے اور ابھی غائب
 ہے۔ بہر حال حنیف قندھاری نے نوجوان شاعر کو تصویر ضروری مگر اس وقت
 جب وہ اپنی چپاسوں ساگرہ منار ہے تھے۔ حنیف قندھاری کو رہا تھا کہ یہ تبادلی
 تصویر ہے اور شاعر کہہ رہا تھا کہ نہیں یہ میری تصویر نہیں ہے۔ میرے بچے کی تصویر
 ہے۔ ترقی پسند مصنفین کے گروپ کی تصویریں انکا کلاوا اپنی عادت کے مطابق
 غائب ہو گیا۔ سب دوستوں کو معلوم تھا کہ یہ شخص تصویریں کبھی نہیں دے گا،
 لیکن ایک روز اتفاق سے میں کافی ہاؤس میں بیٹھا تھا کہ حنیف قندھاری کبیرہ
 بعل میں لٹکائے آگیا۔ اس نے مجھے اس گروپ پر فورسکے تین پروف دکھائے
 ”یہ پروت ہیں؟ ابھن انھیں ڈی ویپ کروں گا۔“

میں نے تینوں پروف اس سے لیے اور غائب ہو گیا۔ بس اس یادگار
 گروپ کی یہ تصویریں میرے پاس محفوظ رہ گئیں۔ انوکس اس میں ابن انشا
 نہیں ہے۔ دانت کے درد کی وجہ سے وہ تصویر اتار دانے سے کچھ دیر پہلے چلا
 گیا تھا۔

حلقہ آریاب ناول ۱۰ اجلاس والی ایم سی اسے کے لہر ڈیوٹم میں جہاز تڑپا تھا۔

جی بڑی میز کے گرد اگر دو سیوں پر لوگ بیٹھ جاتے۔ ہرے زور دار اجلاس
 ہو کر تے تھے۔ مگر اگر کم بیش ہوا کرتی جس میں سبھی اجاب صاحب مقدر جیت لیتے۔
 وہاں قاعدہ تھا کہ ایک کاغذ کاغذی مٹو ٹیبل کے ساتھ شریکات محفل میں ہاتھوں
 ہاتھ گھوما کرتا جس پر لوگ اپنا نام لکھ دیتے۔ پھر یہ نام اگلے اجلاس میں کھیلے
 بستے کی کارروائی سنا تے ہوتے پڑتے جاتے کہ فلاں فلاں صاحب اجلاس میں
 شریک تھے۔ ہم شراد میں ضرور کیا کرتے۔ ایک اجلاس میں ابن انشا اور میں
 ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ کاغذ کا پرچہ ہمارے پاس آیا تو میں نے اپنا نام بغدادی پڑ
 لکھ دیا۔ ابن انشا نے اپنا نام فلیف بارون الرشید لکھ دیا۔ تیرم نظر صدارت
 کر رہے تھے۔ جب پرچہ ان کے پاس گیا تو ان کی نظر پر گئی۔ مسکوا کر بولے۔
 ”حضرات! آپ کو کئی کرغوش ہوگی کہ ہمارے آج کے اجلاس میں
 بغدادی سے فلیف بارون الرشید اور بغدادی چہر بھی تشریف لائے
 ہوئے ہیں۔“

لوگوں نے ایک دوسرے کو دیکھنا شروع کر دیا۔ جس روز حلقے کے اجلاس
 میں سعادت حسن منٹو افسانہ پڑھتے آتے اس روز محفل بڑی دلچسپ ہوجاتی۔ منٹو
 صاحب بڑی تیز باتیں کرتے۔ ایک بار انھوں نے افسانہ پڑھا تو ایک صاحب
 نے فرمایا کہ اس کہانی میں فلاں فلاں جتیر کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ منٹو صاحب
 اپنی عقابنی نظروں سے اُسے کچھ دیر دیکھتے رہے جب وہ صاحب بات ختم کر چکے تو
 منٹو نے ان کی طرف انگلی سے اشارہ کر کے کہا۔

”مجھے تمہارے دماغ میں عقل کی کمی محسوس ہوتی ہے۔“

ایک بار حلقے کے اجلاس میں میرا افسانہ تھا۔ منٹو صاحب سے سیڑھیوں
 میں میری ملاقات ہوئی۔ میں نے اُس سے سلام کیا۔ کہنے لگے۔
 ”اسے جلد آج میں تیری کمال کہیںوں گا۔“

میں نے افسانہ پڑھا۔ منٹو صاحب نے صپ وعدہ میری کمال بھی کہی اور کچھ

تقریباً ہی کی۔ میراجی کی یاد میں مٹنے کا جو سالہ اجلاس ہوا اس میں میراجی کے چھوٹے بھائی کا مئی صاحب وادین پر میراجی کا پسندیدہ رنگ بے جے ونٹی ضرور ملتا ہے۔ ایک دفعہ منو صاحب ترنگ میں تھے۔ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ متحلی کا پتہ مل بنا کر اسے دو تین بار جھٹکا اور بولے۔

”اوتے تہیں کیا پتا ہے جے ونٹی کیا ہوتا ہے۔۔۔۔۔“

ترقی پسند مصنفین کے حیلوں میں زیادہ گر جوشی ہوا کرتی یہاں افسانے یا کہی نظم پر بحث ہوتی تو لاطینی امریکہ سے لے کر گوریا تک کے حوالے دیتے جاتے اور ہینگلی کی جدیدیات بھی زیر بحث آجاتیں۔ ظہیر کا شہری اور عبداللہ ملک لہرن شروع کرتے تو سامعین صاحب صدر کے ہاتھ جوڑ کر انہیں چپ کراتے۔ ابراہیم جلیق ترقی پسند مصنفین کے اجلاس میں اپنا حیدر آباد کارپور تار پڑھا تو اس کی بڑھی دھوم مچی اور کئی روز تک ٹی ہاؤس اور کافی ہاؤس میں اس پر باتیں ہوتی رہیں۔

پاک ٹی ہاؤس میں ابن انشا میں اور ناصر کاظمی، بیٹے شعروادب پر گفتگو کر رہے تھے۔ چائے کا ڈور چل رہا تھا۔ ناصر کاظمی کا سگریٹ اپنے آخری کنارے تک پہنچ گیا تھا لیکن وہ اسے دوا انگلیوں میں پکڑے ہرے ماہر انداز میں پھر بھی پیے جا رہا تھا۔ ناصر کاظمی سگریٹ کو اس کے آخری کنارے تک پیتا تھا۔ گفتگو رہا بنائے، پھلور اور امرتسر کی برساتوں پر جو رہی تھی ہم اپنے اپنے شہروں کی برساتوں کی تقریبن کر رہے تھے میں نے ناصر کاظمی سے کہا۔

”ناصر! تمہیں ایک شہنوی لکھنی چاہیے۔ جس میں صرف تمہارے شہر کے موسموں، بارشوں اور خشوں اور پرندوں کا ذکر ہو۔“

ابن انشا بولا۔

”انسانوں کا ذکر کیوں نہ ہو؟“

”ہاں اگر وہاں انسان ہوں تو ان کا بھی ذکر کر دینا۔“
ناصر کاظمی نے سگریٹ سے دوسرا سگریٹ نکلیا۔ پہلا سگریٹ انا چھڑا سارا گیا تھا کہ اس کے ہاتھ میں ہی کہیں گم ہو گیا۔ مسکرا کر بولا۔

”اے حید میرے شہر کی برسات سے انسان کی خوشبو آیا کرتی تھی۔

میں نے ایک شہنوی شروع کر رکھی ہے۔ کسی وقت اس کے کچھ شہرنا ڈکھا۔“
ابن انشا نے کہا

”سامے جب ہم بڑے ہو گئے ہوں گے تب تم وہ شہنوی پوری کر دو گے۔“

ناصر کاظمی مسکراتا رہا اور اپنا ہاتھ جوڑوں کے پاس کئے سگریٹ کے بلکے پکے کش نکالتا رہا۔ ناصر کاظمی کی شہنوی کبھی مکمل نہ ہوئی۔ سال ہی میں اس کی ایک کتاب بارش، شیشی غلام علی اینڈ منتر نے شائع کی ہے۔ اس میں ایک ہی غزل مسلسل ہے۔ میراجیال ہے کہ شاد ہے، اسی شہنوی کا ایک حصہ ہے جو ناصر کاظمی نے آج سے اٹھائیس برس پہلے شروع کی تھی اور جسے وہ ختم نہ کر سکا تھا۔ ناصر کاظمی اٹھ کر چلا گیا۔ میں اور ابن انشا اپنے اپنے شہروں کی باتیں کرتے گئے۔ میں نے ابن انشا کو بتایا کہ میں نے پھلور شہر دیکھا نہیں۔ ہاں اس کے شیشی سے دلی، لکھنے آتے جاتے کئی بار گذرا ہوں۔ ابن انشا بولا۔

”پھلور کا شیشی تو چھوڑنا سنا تھا البتہ انیسے کا شیشی بڑا وسیع تھا۔“
میں نے کہا۔

”جیسے انبار کینٹ شیشی زیادہ پسند تھا۔ کشادہ صاف ستھرے پلیٹ فارم، اونچی چیمت اور رنگین رسالوں سے بچھے ہوئے کبک سٹائل جب ریل انبار چھاؤنی سے باہر نکلتی تو کافی ڈوڈا تک نیم کے گھنے درخت ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ جاتے۔“

”ہمارے ہاں نیم کبکیز بہت تھے۔ برسات کے دنوں میں لمبی

یہی جھڑپاں گئیں تو ان درختوں میں راتوں کو کھیں
 بولا کرتی تھیں۔

آنا بکر کو ابن اشفاق نے شرکی برساتوں میں اور میں امرتسر کی بادوں میں
 کھو گیا۔ میں نے فی ہاؤس کے شیشے میں سے اشفاق احمد کو باہر سائیکل کھڑی
 کرتے دیکھا اور انشاء سے کہا۔
 وہ گھڑیا آگیا ہے۔

ان دنوں اشفاق احمد کی کہانی لکھ دیا۔ کا پڑا شہر تھا اور میں اُسے گڈر یا
 کہا کرتا تھا۔ اشفاق کے ساتھ ہی مزید چائے آگئی۔ ایک بار پھر گرجہ رشتی سے
 باتیں شروع ہو گئیں کچھ دیر بعد میں اور انشاء فی ہاؤس سے آچھ کوبال روڈ
 پر آگئے اور پیرنگ کراس کی جانب چل پڑے۔ مال روڈ پر اتنا رشت نہیں ہوا کرتا
 تھا۔ شہر بھی نہیں ہوتا تھا۔ مال کے ساتھ ساتھ گئے ہوتے تھیل کے درختوں پر
 چڑیاں طوطے اور کوسے۔ رُٹے۔ ٹٹے۔ بٹھے اپنی اپنی بولیاں بولا کرتے تھے۔
 ہم بٹتے مسکراتے، ہنستے جھپٹ کرتے، لورڈ لیگنڈ میں آکر بیٹھ گئے۔ ہمارے
 پاس تین روپے تھے۔ چائے منگوائی اور باتیں کرنے لگے۔ خدا جانے وہ کیا باتیں
 تعجب کو ختم ہونے میں ہی نہ آتی تھیں۔ ایک موضوع ختم ہونا تو دوسرا شروع ہونا
 "لورڈ لیگنڈ" کا ماحول نسبتاً پرسکون تھا۔

یہاں سے اُنھے تو لادائش باغ کی سیر کرنے لگے۔ پھر چڑا گھر آگئے اس کے بعد
 اوپن ایئر کیفے میں بیٹھ کر پھر جاتے چنے اور باتیں کرنے لگے۔ شام کو میں نے
 ابن اشفاق کو اس کے گھر چھوڑا اور واپس فی ہاؤس آگیا۔ یہاں آدھی رات تک
 غفلت میں رہی۔ رات بارہ بجے کے قریب میں اٹھا اور اپنے گھر معری شاہ کی
 طرف روانہ ہو گیا۔ دو بجے رات تک ایک اٹھانے پر کام کرتا رہا۔ پھر سو گیا۔
 صبح آچھ کر سیر کو نکل گیا۔ واپس آکر ناشتہ کیا اور سیدھا ابن انشاء کے گھر پہنچ گیا
 ابن انشاء کے والد صاحب آج کل میں چار پائی پر بیٹھے تھپتی رہتے تھے۔ میں نے

ادب سے سلام کیا۔ انھوں نے تباہ کن شیر محمد بھی سوراہا ہے۔ میں ان کے پاس
 بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ ابن انشاء کے والد بڑے مرتبہ بال مرغ، کم سن اور عیت
 کرنے والے بزرگ تھے۔ خالص جلع جالندھر کے بیٹھے اپنے میں بات کرتے۔
 تھوڑی دیر بعد انشاء بھی آچھیں مٹا، ٹیک بھا آگیا۔
 "ارے تم رات کو سوئے بھی ہو کر نہیں؟"
 میں نے آنکھ مار کر کہا۔
 "بس اب جلدی سے تیار ہو جاؤ۔"

اس کے بعد پھر وہی دن بھر کی آوارہ گردیوں کا سلسلہ چل نکلا۔ دوپہر
 کے وقت انشاء نے کہا کہ ذرا اخبار میڈار کے دفتر تک چلا ہے۔ ایک
 ضروری خبر دیکھنی ہے۔ ہم مال روڈ سے چل کر میڈار کے دفتر آگئے۔ یہ بڑی
 شروع شروع کی بات ہے۔ ابھی مولانا ظفر علی خاں حیات تھے۔ اگرچہ کافی
 ضعیف ہو چکے تھے۔ کاتب حضرات تخت پوش پر بیٹھے دیوار سے ٹیک لگائے
 لکھ رہے تھے۔ میز پر اشرف عطا اور تارش رفوی صاحب بیٹھے خبروں کی کھنٹ
 چھانٹ کر رہے تھے۔ کبھی کبھی میں ظہار حسن ڈار بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ مصحفی
 خان ہیں اپنے کرسی میں لے گئے۔ انھوں نے ہمارے لیے چائے منگوائی۔
 ابن انشاء نے کہا۔

"مولانا پہلے جعرات کا میڈار اخبار منگواتے۔"

اتنے میں مولانا ظفر علی خان اندر آئے۔ انھوں نے جسے تیز تر بیٹھے میں
 منہ سے کوئی بات کی ہے ہم بالکل سمجھ سکے۔ منہ سے اپنے والد بزرگوار کی
 ہر بات پر سر ہل کر کہتا رہا۔

"بھائی انشاء! بسا اشد!"

جب مولانا پہلے گئے تو منہ سے لے کر کھاتے ہوئے جیسے اپنے آپ
 سے کہا۔

”کچھ سمجھ میں نہیں آیا اب کیا کہہ گئے ہیں۔“

منصور علی خان کے کمرے سے باہر نکلے تو دیکھا کہ نیمزدروم میں مولانا خضر علی خان آرام کرسی پر تشریف رکھنے لگی اخبار کا تراشہ پڑھ رہے ہیں۔ ہم نے بڑی عقیدت سے آگے بڑھ کر ان سے ہاتھ ملایا اور احتراماً کچھ دیر ان کے پاس ہی نشست پوٹن پر بیٹھ رہے۔ مولانا بڑے فصیح ہونگے تھے پھر بھی انھوں نے کمزور آواز میں ہماری غیر ضرورت پر بھی ہم سر جھکاتے بیٹھے ان کی خاموشی سے ہی کلفت اندوز ہوتے رہے جس میں خبرداروں داستانیں سانس لے رہی تھیں۔

نیمزدروم کے دفتر سے ہم پیدل ہی ہو کر کشمیری طرف چل پڑے ہفتہ وار چٹان، کے دفتر کے باہر رحمان ساتھی سے ملاقات ہو گئی۔ یہ ڈبلا پٹلا پر جوش لڑاکا کرنا ل کارہنہ والا تھا۔ دوسری جنگ عظیم میں افریقہ کا محاذ دیکھ چکا تھا۔ ان دنوں چٹان میں کام کر رہا تھا۔ اس نے مجھے افریقہ کے محاذ کی ایک کہانی سنائی تھی جس پر میں نے ”پھول گرتے رہے“ افسانہ لکھا یہ ایک ایسے ہندوستانی فوجی نوجوان کی کہانی تھی جو اعلیٰ کے کنٹرول میں سے فرار ہو کر ایک اعلیٰ خانہ دار کے ہاں پناہ لیتا ہے۔ رحمان ساتھی ہمیں لے کر لاہور جوش کے سامنے والے ٹی سٹال پر آگیا۔ ٹھٹ ہاتھ پر کرسیاں بھی تھیں۔ ہم یہاں بیٹھ کر بات چیت کرنے لگے۔ رحمان ساتھی ابن انشا کی طویل نظم ”بقدرِ ایک رات“ کی تعریف کر رہا تھا۔

”انشا صاحب! آپ کی نظم میں مشرق کی روایتی ردائیت بھی

ہے اور محنت کشوں کی انقلابی جدوجہد بھی۔“

رحمان ساتھی نے مجھے حیب سے ایک خط نکال کر دکھا یا پو پشا درے کے ایک لڑکی نے لکھا تھا۔ خط بڑا محبت بھرا تھا۔ رحمان ساتھی نے خط میرے ہاتھ سے لے کر دوبارہ تکرار کے حجب میں رکھا اور قلم لگا کر لولا۔

”ویسے میں اس لڑکی سے شادی کر رہا ہوں۔“

رحمان ساتھی کی اس لڑکی سے شادی ہو گئی۔ وہ پشاور کے اخبار روزنامہ ”شہباز“ کے ادارت سے منسلک ہو گیا۔ لیکن عمر نے وفاداری کچھ عرصہ ہی کے عرصہ میں متلا رہ کر جوانی میں ہی چل بسا۔ خدا مغفرت کرے۔ آج بھی یاد آتا ہے تو اس کی موتی صورت آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ ”پھول گرتے ہیں“ میرا افسانہ میری کتاب ”کچھ یادیں“ کا ”آتش“ میں محفوظ ہے۔ جب کہیں اتفاق سے اس افسانے کو دیکھتا ہوں تو رحمان ساتھی کی یاد آ جاتی ہے کیسے کیسے پھول اپنی ٹہنیوں سے ٹوٹ کر خاک میں مل گئے۔

ایک روز کافی دوس کے باہر ایک صاحب مل گئے۔ نام ان کا بھول گیا ہوں۔ شکل یاد ہے۔ سیاہ چشمہ پھر میرا سانولا بدن۔ ہیرس کی ٹوٹے کا گھنٹھ کرٹا ہادی سامبر کا بوٹ اور نیلے نقوش۔ ابن انشا۔ ان صاحب سے بات کرنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ ان کے کوٹ پر گردن کے قریب ایک بال چکا ہوتا ہے۔ میں بال کو ہٹانے لگا تو جلدی سے اترے۔

”اونہوں۔ اسے یہیں رہنے دیں۔ جذباتی ایسوی ایشن۔“

آج کل ان صاحب کو میں کہیں کہیں مالی روڈ پر دیکھتا ہوں۔ ان کے منہ پر ایک بھی جذباتی ایسوی ایشن باقی نہیں رہی۔

شتر کے اندر ہمارے ایک رشتہ دار کی شادی تھی۔ میں نے ابن انشا سے کہا کہ چند تہیں لاہور کی ایک بارات دکھانا ہوں۔ ہم اپنی ہاؤس سے اٹھ کر اندرون شتر آ گئے۔ شادی والے گھر میں بڑی روزنی تھی۔ مٹی میں چھڑکاؤ گھر کے مکان کی دیوار کے ساتھ کرسیاں لگا دی گئی تھیں۔ شتر و سپید چروں والے شتر لاہور کے پرانے کشمیری برسیاں پہنتے شالیں کندھوں پر ڈالے پان جہانے ہوتے کر لون اس کے سگریٹ چوبک رہے تھے میرے کھٹے دل کے بجائے آتے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے ابن انشا کا تعارف کرایا۔ انھوں نے

کر یوں اسے کیڑی میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”میں جانتا ہوں تم سگریٹ پیٹے ہو۔“

پھر انھوں نے گلی میں بیٹھے بیٹھے آدھ کھڑکی کی طرف منہ اٹھا کر ادبھی آوازیں کجی۔

”اوتے سلطان اماں سے کہو جاتے کا سوادار نیچے ہی بیٹھ دے
چچا کو باتیں کرنا دیکھ کر دوسرے رشتے دار بھی ان کے پاس آکر بیٹھ گئے۔
کیونکہ چچا بڑی دلچسپ باتیں کرتے تھے۔ گول مثول لال سرخ چہرہ، بھاری بدن
پوسل کی تھیں، سرسے کے مین، شلوار اور سیاہ فلکیں کا پاپ شرت۔ کر یوں نے
کاکش لگا کر بولے۔

”تم نے کوچ رنگرزاں کے خواجہ سعد اللہ کو تو دیکھا ہی ہوگا۔ ان

کے پاس ایک گھوڑا رہ گیا تھا جسے وہ فروخت کرنا چاہتے تھے۔

ہمارے پاس ریسٹیٹنگ تھا گھوڑا نہیں تھا۔ سو چچا کو خواجہ کا گھوڑا

خرید لیتے ہیں۔ میں نے ایسا رخو کرنا ساتھ لیا اور میریوں والے

احاطے میں آگیا۔ یہاں دیکھا کہ ایک گھوڑا میری کے درخت کے

نیچے کھڑا ہے۔ دوسرے یوں لگا جیسے گھوڑے کا ایکسے کھڑا

ہے۔ قریب گئے تو دیکھا کہ ایک رسی گھوڑے کی کمر کے گرد ڈال

کر آدھ میری کی شاخ سے باندھ رکھی ہے۔ پوچھا کہ بھئی یہ رسی

کس کے لیے باندھ رکھی ہے؟ کہتے لگے کہ جناب اگر رسی کھول

دیں تو گھوڑا گر پڑے گا۔ بہر حال گھوڑے کی قیمت پر بات شروع

ہو گئی۔ خواجہ کے آدمی نے ایک رقم لگائی۔ میں نے کم کرنے کو

کہا وہ زمانے کچھ میں نے رقم بڑھا دی۔ کچھ انہوں نے کم کر دی

آخر ایک روپے بارہ آنے پر سودا ہو گیا۔ ہم نے گھوڑا خرید لیا۔

کھولنے لگے تو خواجہ کے آدمی نے منع کیا اور کہا۔ میری باتیں اور

ایسا ویسی ناگہاں اسی جگہ لے آئیں، کیونکہ خطرہ ہے گھوڑا اگر پڑے گا۔ تو

جناب ہم ہاتھ لگے آئے۔ اسے گھوڑے کے پیچھے لے جا کر گھوڑے

کو کس دیا۔ خواجہ کے آدمی نے لائن کلیئر یا کر آدھ میری کی شاخ

سے رسی کھول دی۔ اس کا کھڈا تھا کہ گھوڑے کے ایک بھر بھری

لی سونپا۔ لو کھڑا یا اور گر پڑا۔ اسے ریڑھے پر ڈال کر کھڑے آئے

رات کو گھوڑے نے دم توڑ دیا۔ ہم نے اسے گلی کے باہر ڈال دیا

امر تفریق کی والے آئے۔ انھوں نے میل چالان کر دیا۔ ایک بچے

بارہ آنے میں گھوڑا تھا۔ میونسپل کمیٹی والوں نے پچاس روپے

جرمنا کر دیا۔“

لوگ چچا کی باتوں کا مزہ لے رہے تھے۔ امین انشا۔ بھی ان کی باتوں اور

انڈاز گفتگو سے بے حد گلف اندوز ہو رہا تھا چچا اپنے ایک شکار کا واقعہ

بیان کر رہے تھے۔

”امر تفریق کی بھئی والی ہنر کے پار میڈا جگل ہوا کرتا تھا۔ ایک بار

کچھ دوستوں کے ساتھ سکولوں والے ٹاقروں کی موٹر میں بیٹھ

کر تفریق کے شکار کو گئے۔ موٹر ہم نے نہر کنارے کھڑی کر دی اور

جھاڑیوں میں ادھر ادھر بندوقیں لیے پھیل گئے۔ میرے پاس

بھی ایک بندوق تھی۔ میں نے ایک تیز دو بکھا۔ جلدی سے جھک

کر گھٹنوں کے بل لگے بڑھنے لگا۔ تیز تر ہو کر ایک جھاڑی میں

داخل ہوا تو میرے جناب دھاتیں سے بندوق چلا دی۔ خدا کی تھرت

دیکھتے کہ بندوق کا فائر میں نے ایک ہی کیا تھا گھر آوازیں دو

آئیں۔ پہلی آواز بندوق کے فائر کی دھاتیں اور ساتھ ہی دوسری

آواز آئی تھا۔ ۱ میں بڑا حیران ہوا۔ یا میرے بولا یہ دوسری آواز

کہاں سے آگئی۔ میں نے سر چاہے دوسری آواز کی درست کی بندوق

کی ہوگی تاہم جب شکار سے فارغ ہو کر نہر کنارے آئے تو معلوم ہوا کہ دوسری آواز نہر ہی کی طرف سے پھیلنے لائی تھی۔۔۔۔۔۔
ابھی مجلس گرم تھی کہ برات تیار ہو گئی۔ لاہور کا مشہور سوہنی جینڈا آگیا۔
سوہنی نے کلارنٹ منہ سے لگا کر جو بھیر ویں گانہ اُڑائی تو زندہ دلان لاہور اس کے گرد جمع ہو گئے۔ ابن انشاء میر سے چچا کے دلچسپ انداز بیان سے بہت متاثر ہوا تھا۔ کہنے لگا۔

”اس شخص میں دلی کے پلانے داستان گوؤں کی خوشبو ہے۔“
دلہا بیاں گھوڑی پر بیٹھ ڈھن کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ آگے آگے سوہنی کا بیٹھ تھا۔ خدا خیرین رحمت کرے ماسٹر سوہنی کو۔ امرتسر کے مالگیر مرحوم کے بعد کلارنٹ بجاتے ہیں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ بھانے کو وہ نمی دمن بھانے کو بیچ بیچ میں ایسی تانیں لیتا کہ لوگ عرش عرش کو اُٹھتے دہانے ساتھ کم ادا اس کے آواز کو زیادہ باراتی ہوتے۔ ہر چور اپنے میں لوگ اُسے روک لیتے اور جی بھر کر راگ سنتے۔ ماسٹر سوہنی کے بارے میں ایک کہانی مشہور تھی کہ ایک بارات کو لے کر نکلا تو کسی چوک میں توہنگ میں آکر کلارنٹ کا فن دکھانا شروع کر دیا۔ پس پھر کیا تھا۔ بارات دھن کے گھر جا پہنچی مگر ماسٹر سوہنی ابھی تک چوک میں اپنے بیٹھ کے ساتھ کھڑا کلارنٹ بجا رہا تھا۔ چچا بھی بارات کے ساتھ تھا۔ اور بڑھ چڑھ کر ماسٹر سوہنی کو دیکھیں دے رہا تھا۔ اُسے راگ داری کی قطعاً سوجھ بوجھ نہ تھی، لیکن ظاہر یہی کرتا کہ اس نے بڑے بڑے کلاؤتوں کو بھری نفل میں لٹکا ہے کہ میاں یہ کون سا سُر لگا رہے ہو؟ بارات تو فی بازار کے چوک میں پہنچی تو چپانے دس روپے کا ڈٹ ایک ٹوکے کے ہاتھ بھرا ماسٹر سوہنی کو کہلایا کہ میاں بھیر ویں ساؤ۔ ہم تو راگ بھیر ویں سُنتا چاہتے ہیں۔ ماسٹر سوہنی نے کلارنٹ ہر منٹوں سے ہٹا کر ماسٹر بنا کر اس ٹوکے کے کان میں کچھ کہا۔ ٹوکے نے چچا کو اکرتایا۔

”ماسٹر جی کہتے ہیں کہ میں بھیر ویں ہی بجا رہا ہوں۔“
ہر چوک میں دہانے دوست بارات روک کر دہانے کو دودھ کا پیالہ پلاتے۔ دہانے گھنٹ پنی کر دودھ باقی شہر بالا کو دے دیتا۔ شہر بالا بھی ایک آدھ گھنٹ چکھ کر پیالہ واپس کر دیتا۔ ابن انشاء نے میر سے کان میں کہا۔
”اس بارات میں سب سے زیادہ خوش قسمت شہر بالا میاں ہیں شادی کی ساری دوسراں پوری کر رہے ہیں مگر شادی کی مصیبتوں سے بچے ہوئے ہیں۔“

ایک جگہ دہانے کو روک کر دودھ پلانے لگے تو میں نے تنگ آکر کہا کہ یہ کم بخت اسے اتنا زیادہ دودھ کس لیے پلا رہے ہیں؟
”یہ ایک طرح سے اُسے حوصلہ دے رہے ہیں کہ میاں حوصلہ رکھو اور آگے بڑھتے جاؤ۔“

اس سے مجھے یاد آگیا کہ ہمارے امرتسر شہر میں ایک صاحب گھڑی پریشانیوں کی وجہ سے دیوانے ہو گئے۔ آپ ان کا کام یہ تھا کہ جنرل انکوارس ہر کروہ بازاروں کیوں میں پھرا کرتے۔ جہاں کہیں کوئی بارات دیکھتے بھاگ کر دہانے پاس جاتے اور بکندہ آواز سے فرماتے۔
”میاں آپ بھی وقت ہے۔ بھاگ جاؤ۔“

کارڈر سے اورا عالمی ہو سکی بھی مل جاتی تھی۔ موسم بہار میں گولڈن کارڈر سے
کے کوٹ ہم دیکھتے تھے۔ اگر خبر ملتی کہ سندھ سے بازار میں کینڈا
کی سوئیڈ کی کوئی جیکٹ آئی ہے تو وہاں بھی پہن جاتے۔

ایک دفعہ میں نے این انشا سے کہا کہ انارکلی میرے ساتھ جیلر ہو سکی خریدتی
ہے۔ مجھے میرے تامل، جھگڑتے ہیں، لکے کافی پیسے مل گئے تھے۔ کہنے لگا۔
"پکڑوں کا شوق بڑا بڑھائی شوق ہے، میرا کہا نا تو اور اس وقت کے
پیسے پیسے بھاگ رہو جب تمہارے پاس مجھے چاہتے پلانے کے لیے
دوٹی بھی نہیں ہوگی۔"

میں نے کہا۔

"میں تمہیں انارکلی میں آم کا جوس پلاؤں گا۔"

جنس کر بولا۔

آب میں تمہارا دل نہیں توڑ سکتا۔ دیے اگر اس شوق میں آم کا جوس
شابل ہر جلتے تو تانہ بڑا بھی نہیں ہے۔"

ہم انارکلی پہنچ کر کپڑے کی ایک دکان میں گھس گئے۔ میں نے ہکی خریدی۔
این انشا نے بھی دو قیصوں کا کپڑا خریدا۔ نیلے چمک کا ڈیزائن بڑا خوشنما تھا۔
ہم نے ایک ساتھ ڈائننگ ٹیبلز کو بیٹے کے لیے دے دیں۔ واپس پر آم کا جوس
پیا۔ ٹی باؤس آئے تو اشتاق احمد سے ملاقات ہو گئی۔ ہم اس کی تصویریں دیکھنے
تھیں ایک مزگرم گرم گرم مکان پر آگئے۔ اوپر دے کمرے میں اس نے اپنا
مٹرو ڈیو بار کا تھا۔ ایڑوں پر ایک کینیرس غیر مکمل پڑا تھا۔ آبل کوئی کوئی تھوڑی
تصویر بنی تھی۔ بعد میں اشتاق احمد نے یہی تصویر متاڑتی تھی کی کتاب اسمارٹس
کے ہائیمل کے لیے دے دی۔ بڑا گرم کمرہ تھا۔ کتابیں کچھ شیلیوں میں اور زیادہ
میزوں پر ڈھیر پڑی تھیں۔

باہر نکل کر چمک ریگل کی طرف آئے تو انور جلال کے گھر چلے گئے۔ وہ بھی اچھے

باس کے معاملے میں این انشا زیادہ حساس نہیں تھا۔
جیسا بل جانا پہن لیتا۔ گرمیوں میں ٹھنڈی تیلوں اور پشیرے اور سردیوں
میں عام طور پر سیل خورے رنگ کا گرم سوٹ پہنتا۔ کوئی میٹن میں نے اسے
بہت کم پہنتے دیکھا ہے۔ ہاں اس کے پاس کوئی کاجھوٹے فانوں والا سرفتی
مالی کوٹ ہوا کرتا تھا جسے اس نے خوب پہنا۔ اس معاملے میں ہم لوگ یعنی
میں، انور جلال، نواز، حبیب احمد آت نمہ خدیجہ صلا اللہ بن سترہ شیدا اور
ڈاکٹر ضیا بہت محتاط تھے اور ہماری ٹوٹی باؤس، کافی باؤس بلکہ مال
روڈ کی خوش لباس ٹوٹی مشہور تھی۔ کشمیری ہرنے کے نلٹے ہمارے گھر میں کشمیری
شالوں کا عام رواج تھا۔ ایک بار میں نے ایک پرائی میرون کمر کی شال کو کڑا
کر قریب بنوائی تو انور جلال اسے دیکھتا رہ گیا۔

"دنڈر فل آئیڈیا اسے عید۔ ایسی گرم قمیص کہیں نہیں مل سکتی۔"
اب ان لوگوں نے بھی اپنے اپنے گھروں میں شالیں تلاش کرنی شروع کر دیں۔
پہنتے بعد انور جلال، بقو، حبیب اور ڈاکٹر ضیا۔ بھی میٹن کی رنگ رنگ
قمیصوں میں میونس تھے۔ دو گھوڑا ہو سکی کی قمیص ان دنوں آسانی سے بن جایا
کرتی تھی۔ آج کل تو دو گھوڑے ہی کر بول کی ایک قمیص بنتی ہے۔ انارکلی میں جوس

والے کمرے میں ایک تصویر بنارہا تھا۔ خالص تجریدی آرٹ تھا۔ ابن انشاء نے اپنے خاص انداز میں کچھ فقرے چسٹ کیے جو مجھے یاد نہیں رہے۔ اور جلال کے قبضے سے کمرہ ایک بار توں گیا۔ یہاں سے نکل کر ہم تینوں کافی ہاؤس کے برابر والے چائینرینج روم میں آ گئے۔ آگے استاد امانت علی خاں اپنی محفل سماتے بیٹھا تھا۔ سرخ و سپید فرامہورت موسیقار بڑا بیادار لگ رہا تھا۔ چائے کا دور ایک بار پھر چلا۔ لیٹھے بازی شروع ہو گئی۔ پاک ٹی ہاؤس سے پیغام آیا کہ شہرت بخاری بلارہا ہے۔ ہم ٹی ہاؤس آ گئے۔ شہرت بخاری نے اپنی چکیلی انجین جھپکا کر کہا۔

”یار نہیں کل علقے میں افسانہ پڑھنا ہے۔ یاد ہے نا؟“

”ہاں بھئی یاد ہے۔“

”لکھ لیا ہے نا افسانہ؟“

ابن انشاء جھٹ بول پڑا۔

”اس کا کیا ہے کسی بھی افسانے کا شروع اور آخر بدل کر پڑھ دے گا۔ اس کے سارے افسانے ایک جیسے ہوتے ہیں۔“

میں نے انشاء کی کمر میں زور سے ہٹا کر سید کیا۔

”تم بھی تو ایک ہی غزل سال بھر سے مشاعرے میں منانے لگے ہو۔“

ابن انشاء۔ زیادہ تر نظمیں لکھا کرتا تھا۔ غزل شاید ہی کسی ہرتی تھی دیے

بھی اس کی غزل مجھے متاثر نہ کرتی تھی۔ خدا قرین رحمت کرے چھارے یار

امانت علی خاں نے اس کی غزل سے انشاء جی انخواب کو قہ کر دیا۔ ”السی

گانی کہ انشاء کی دھوم مچ گئی تھی۔ تب مجھے بھی معلوم ہوا کہ ابن انشاء تو سچ

پڑے بڑی اچھی غزل کہتا ہے۔ شرمناک سے معاملے میں بھی انشاء بڑا شریک

تھا۔ محمود جیلانی گورنمنٹ کالج لاہور کے ہوسٹل میں رہتا تھا، ایک روز میں

ابن انشاء اور استاد امانت علی خاں اس کے کمرے میں گئے، محمود جیلانی

بڑا انہیں مکھڑا متواضع اور زندہ دل لگا تھا۔ اس

کے کمرے میں ہی ہم نے کیتی میں چائے بنائی۔ محمود کہیں سے ہارمونیم

اٹھالیا۔ اس پر گرجو بھی ہوئی تھی۔ امانت علی خاں نے رومال سے ہارمونیم

صاف کیا اور انشاء سے کہا۔

”دانشاء صاحب! اپنی کوئی غزل سنائیے۔ میں اس کی ابھی

طرز نہادوں گا۔“

ابن انشاء شرماسا گیا۔ کہنے لگا۔

”پھر کسی وقت بھی۔“

جب ہم نے بہت زور دیا تو انشاء نے ایک غزل سنائی جو بڑی

غیر معروف تھی غزل تھی اور لمبی بحر میں تھی۔ امانت نے اسی وقت غزل کی طرز

تیار کر دی اور گار سنائی۔ ہارمونیم بے سُر تھا۔ طبلہ بھی نہیں تھا۔ لیکن امانت

کی آواز نے وہاں سماں باندھ دیا۔ محمود جیلانی کے ہوسٹل سے نکلے تو پاک ٹی

ہاؤس میں آکر دوستوں میں بیٹھ گئے۔

ابھی دنوں سردیوں کے موسم میں ایک لڑکی نے مجھے ٹیلی فون کرنا شروع

کر دیا۔ میرے لیے یہ کوئی آنکھ بات نہیں تھی۔ جیسے بھی میں ایک لڑکی سے

محبت کر رہا تھا اور وہاں شادی کی بات چیت شروع ہونے والی تھی۔ میں

نے کوئی خاص پروا نہ کی۔ لڑکی کا فون آتا۔ میں ادھر ادھر کی دوا دیک باتیں

کر کے فون بند کر دیتا۔ یہ ٹیلی فون پاک ٹی ہاؤس میں آتے تھے۔ ٹی ہاؤس کا

غیر ہمارا دوست سلیم الدین تھا۔ چلتے اور شعر و ادب کا رسیا تھا۔ ایسی چلتے

بنانا کہ محسوس ہوتا اور جھٹکے چائے کے باغ میں بیٹھ کر چائے پی رہے ہوں۔ ایک

روز اس لڑکی کا فون آیا تو سلیم الدین کہنے لگا۔

”کیا کیا جاکر چلا رہے ہو؟ ریحان کو کیا منہ دکھاؤ گے؟“

میں نے کہا۔

ابن انشا۔ نے مجھے بہت سہایا کہ میں اس خطرناک ارادے سے باز
آ جاؤں۔ لیکن میں اُسے یہی کتاب لکھ کر میری مروا گئی کی تو بہن ہے کہ میں اب
بھاگ جاؤں۔

تم فکر نہ کرو۔ میں انشا۔ اس روٹی کو جا کر صرف سبھاؤں لگا
اور لیں۔

تم کو اس کرتے ہو۔ تم کہاں کے شیخ سعدی ہو کہ اسی رات کو
روٹی کے گھر کی دیوار بچاؤ کر کے نصیحتیں کرنے جا رہے ہو؟ اور
اگر کوئی نے پوچھ کر پوچھ لیا۔ اس روٹی کے گھر والے جاگ پڑے
تو پھر کیا ہو گا۔ اجادوں میں طبرک جاتے گی۔ یہ سناؤں کا کیا حال
ہو گا۔ ساری زندگی اُس سے تمہاری شادی نہ ہو سکے گی کہنے! باز
آ جاؤ۔

مگر میں فیصلہ کر چکا تھا۔ دن میں جا کر میں کوٹھی کا مل وقت دیکھ آیا۔ جس
دیوار کو مجھے بچانا تھا، وہ دیوار بڑھو اور اپنی تھی اور اوپر سے مٹن بچیاں کی پیل سے
ڈھکی ہوتی تھی۔ کوٹھی کے باہر روٹی کے باپ کا نام لکھا تھا۔ واقعی مشہور روٹی
تھا۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ اگر واقعی پوچھ لیا تو کیا ہو گا؟ کسی کو منہ دکھانے
کے لائق نہ رہوں گا۔ سانسے خاندان کی بڑائی ہوگی۔ کیا جانے کہ روٹی بھی
بہدوسے کر لے کیا سلوک ہو کون ہے؟ کیا جانے پچوسے جانے کے بعد خود
بھی چور چور کا شور مچا دے۔ طرح طرح کے خیال دوسرے اور اندیشے دل میں
اُڑ رہے تھے۔ لیکن میدان سے بھاگ جانے کی بے حقیقی بھی مدداشت نہیں ہو رہی
تھی۔ خاص طور پر جب ایک روٹی کے حوالے کیا ہو۔ میرا خدا جانتا ہے کہ میرا دل
بالکل پاک اور صاف تھا کہ دل پاک صاف تھا۔ یہ مجھے آج تک معلوم نہیں ہو سکا۔
جو ملک ہے اس میں دیکھنا کہ محبت کا داخل ہو۔ جو ملک ہے اس میں کچھ اور غرض
اور پھولوں سے پیار کرنے کا ہو۔ بہر حال اس روٹی کے بارے میں میرے دل میں

کوئی بُرا خیال نہیں تھا۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب کچھ اللہ کی جانب سے تھا۔
میں نے ابن انشا۔ کو تیار کرنا شروع کر دیا کہ رات کو وہ بھی میرے ساتھ چلے۔
وہ تو سنت غصے میں آ گیا۔

میں نہیں جانتے سے روک رہا ہوں اور تم مجھے بھی اس نصیبت
میں گھبیٹ رہے ہو۔

میں نے اُسے بتایا کہ کوٹھی کی دیوار ڈیڑھ مرد اور بچی ہے اور اس کی مدد
کے بغیر میں اُسے نہ بچاؤں گا۔

اچھا تو تم مجھے بلور بریضی اپنے ساتھ لے جا رہے ہو۔ میرا
دامع نہیں خواب جو تمہارے ساتھ چل دوں۔

مگر میں نے اُسے سنا ہی لیا۔

شام تک ہم پاک فی ہاؤس میں بیٹھے رہے۔ شام کو اس روٹی کا پھر
ٹیلی فون آیا۔ وہ تصدیق کرنا چاہتی تھی کہ میں رات کو آ رہا ہوں؟ میں نے کہا۔
"ایک بار کہو دیا ہے کہ آؤں گا۔ دوبارہ فون نہ کرنا۔"

اس رات سردی بھی بہت تھی۔ پاک فی ہاؤس سے نکل کر ہم مل پر کچھ دور
بیٹھے رہے پھر کھانا کھایا۔ رات کے دس بج گئے۔ اب ہم اس کوٹھی کے قریب
ہی اپنے ایک دوست کے بوسٹل میں آ گئے۔ چائے بنا کر پیتے رہے۔
جب رات نے ہلنے بارہ بج گئے تو میں نے اُس سے ابن انشا۔ کو اٹھنے
کا اشارہ کیا۔ ہم نے اپنے دوست سے اجازت لی اور سڑک پر آ گئے۔ سڑک
سنان تھی۔ سردی زوردار پر تھی۔ ابن انشا۔ کہنے لگا۔

کہنے! اب بھی دقت ہے۔ باز آ جا۔ کہیں بچنے کے دینے نہ پڑ جائیں؟

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور روٹی کے گھر کی طرف چل پڑا۔ پرمیسی لائٹس
کے قریب سے گزرتے ہوئے ابن انشا۔ بولا۔

مجھے تو خوف آ رہا ہے۔
میں نے کہا۔

”درجے بھی لگ رہا ہے انشاء۔ مگر مجبوری ہے۔ جانا ہی پڑ گیا۔
”سائے تو عاشقوں کا مازن کس لیے بن رہا ہے؟ یہ تہیں
بناتے دیتا ہوں کہ تمہیں دیوار پر چڑھا کر میں وہاں سے زبردستی
ہر جاؤں گا۔“
”بے شک چلے جانا۔“

سڑک ایک خوبیل کی عمارت کے عقب میں آگئی۔ یہاں سڑیٹ پیپ
روشن تھے۔ سائے وہ کھڑی تھی جس کی جتنی دیر ارہجے بچا نہ تھی۔ میں نے
گھڑی میں وقت دیکھا۔ رات کے پورے بارہ بج رہے تھے۔ منہ سردی
اور گہری خاموشی تھی۔ میں آگے آگے تھا۔ ابن انشاء میرے پیچھے پیچھے تھا۔ ہم
جھک کر چروں کی طرح چل رہے تھے۔ کوٹھی کی جتنی دیر ارہجے بچا نہ تھی۔ میں نے
کی بل اندھیرے میں دیوار کے اوپر کالے لحاف کی طرح پڑی تھی میں نے
سرگوشی میں کہا۔
”دیوار کے پاس چلو۔“

ابن انشاء نے سرگوشی کی۔

”وہ کم بہت آئی ہی ہے کہ نہیں۔“

”شی! چل کر دیکھتا ہوں۔“

ہم دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے۔ میرا دل زبرد زبرد سے دھڑک
رہا تھا۔ عین اور زلت میں آگیا ایک دیوار عالی تھی لیکن میں جھاک
نہیں سکتا تھا۔ میں نے انشاء سے کہا۔

”دیوار کے ساتھ بیٹھ جاؤ۔ میں تمہارے کندھوں پر پاؤں رکھوں گا
پھر تم کھڑے ہو جانا۔“

ابن انشاء نے دلی زبان میں گالی دی اور دیوار کے پاس بیٹھ گیا۔
میں نے اس کے کندھوں پر ایک پاؤں رکھا۔ دیوار کا سہارا لیا۔ پھر دوسرا
پاؤں رکھا اور اسے کہا کہ کھڑے ہو جاؤ۔ وہ آہستہ آہستہ اوپر اٹھنے لگا میرا
ہاتھ مشت چپچاپ کی بل پر پڑ گیا۔ میں نے ایک ہانگ دیوار کے اوپر آؤ الدی۔
ابن انشاء پیچھے سے کھینک گیا۔ میں نے دیکھا۔ وہ اندھیرے میں اپنی عینک
ٹھیک کر رہا تھا۔ پھر منہ اوپر کر کے آہستہ سے بولا۔
”میں جا رہا ہوں۔“

اور وہ میرے دیکھتے دیکھتے اندھیرے میں گم ہو گیا۔ میں نے دوسری
ہانگ بھی دیوار پر مشت چپچاپ کی بیلوں میں کر لی اور کچھ دیر بالکل ساکت وہاں
ہو کر دیوار پر اندھے منہ بٹھا رہا۔ اتنے میں گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنائی
دی۔ میں نے سر کیل کی ٹانگوں میں کر لیا۔ تین کانسیل گھوڑوں پر سوار گشت
لگاتے ہوئے سڑک پر سے گذر گئے۔ میں نے دل میں دعا مانگی کہ یا اللہ! ابن
انشاء غیرت سے نکل گیا ہو۔ وہ نکل چکا تھا۔ گھڑ سوار کانسیل جب دُور
نکل گئے تو میں نے دیوار کے دوسری طرف جھانکا۔ یہ کوٹھی کا تنگ سا جتنی
آگن تھا۔ ہر طرف گہری خاموشی اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ برآمدے میں چھین
گڑی تھیں۔ دیوار کے ساتھ ہی امرو کا ایک درخت لگا تھا۔ روکی وہاں نہیں
تھی، لیکن امرو کے درخت کے نیچے ایک چھوٹی سی موم جی روشن تھی۔
یہ اس روکی کی طرف سے اشارہ تھا کہ میں جاگ رہی ہوں۔

امرو کے پیرتے آدھی رات کو موم جی روشن دیکھ کر مجھے امرتسر کا قریب
یاد آ گیا۔ میں جھپ چاپ دم سامنے دیوار کے اوپر مشت چپچاپ کی بل میں بیٹھا
رہا۔ اب مجھے سردی نہیں لگ رہی تھی۔ اتنے میں برآمدے کی جتنی ایک طرف
سے ڈرامی ہوئی اور اندھیرے میں مجھے ایک دلی چپکی سی روکی کا سایہ اپنی طرف
بڑھتا نظر آیا۔ دیوار کے قریب آ کر اس نے منہ اوپر اٹھا کر دیکھا۔ میں نے ہاتھ

ہلا کر اسے بتایا کہ آگیا ہوں۔ اس وقت مجھے اپنے آپ پر دور قہماعت کے بہادر مائتوں کا گمان ہو رہا تھا۔ جو آدمی رات کو کھڑے تھوڑی کی دیر میں چاند کو اپنی مہربانوں سے ملنے جایا کرتے تھے۔ لڑکی نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے نیچے اترنے کو کہا۔ اس نے پہلے ہی دروازے میں ایک مبائل خطرناک رکھا تھا۔ تاکہ میں اس پر باؤں نہ کر کر اطمینان سے نیچے اتر سکوں۔ میں اس لڑکی کی چالاک پر ہڑا حیران ہوا۔

میں کوئی کئی گھنٹے میں کود گیا۔ لڑکی نے مرم جی پونک باکرہ بھادی اس کی عمر سو سال سے زیادہ نہیں تھی مجھے اس وقت وہ ایک ایسی اتنی پہلی معلوم ہوتی جس نے اٹھلے پن میں کسی شیر کو اپنے گھر لے کر آئے ہوئے ہوئے اس کی خوش قسمتی تھی کہ میں بھوکا نہیں تھا، لیکن اس لڑکی کے پیٹ کا قدم اٹھانے میں کوئی شک نہیں تھا۔ میں سوچنے لگا۔ اس نو عمر کنواری لڑکی کے مال باپ اندر گھر کا مالوں میں دیکھ سورتے ہیں۔ انھیں کوئی خبر نہیں کہ ان کے خاندان کی عزت تھی جو تیری پر کھڑی ہو گئی ہے۔ کیسے مال باپ میرے اچھے خیال آیا۔ ہو سکتا ہے ان کے ذہن میں عزت کا سہارہ نہ ہو۔ مگر ایسا ہر نہیں سکتا۔ بہر حال وہ لڑکی میرے سامنے بیٹھی تھی۔ میں اس کے پاس کھل پڑھا تھا جو اس نے پہلے ہی بھاڑ کا تھا اور ہمارے اوپر خدا ہمیں دیکھ رہا تھا۔ اس وقت مجھے احساس نہیں تھا کہ خدا ہمیں دیکھ رہا ہے۔ یہ مجھے آج خیال آتا ہے۔ اس وقت مجھے میں چپکرا احساس تھا کہ وہ مرد کا درخت تھا جس کی گھٹی شاخوں میں سے آدمی رات کے اندھیرے میں بچے اور دووں کی جبک آ رہی تھی اور مجھے لگا وہ دی لاسیب کا درخت یاد آ رہا تھا۔ وہ فاشا کم سن دیہاتی لڑکی لیکن یاد آ رہی تھی جس کی لاش ایک روز صیب کے درخت کے نیچے تالاب میں بہی تھی اور اس پر صیب کے شگونے اپنی ٹہنیوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ گلابی شگونے ا

والی پر اس انتشار میں تھا، چنانچہ مجھے اکیلے ہی کو پڑھ کر دواؤں کی دوا سے چھلا لگائی پڑی۔ میں بچوں کے بل گرا۔ اور میرا سر زمیں سے ٹکرائے گئے تھے۔ رات داخل رہی تھی اور سخت سردی میں سرگرمستان تھی۔ میں نے اس لڑکی کو بہت سمجھایا تھا اور سننے کیا تھا کہ آئندہ کبھی ایسی حرکت نہ کرے۔ لیکن دو روز بعد مجھے پھر وہی دروازہ بچاندنی پڑی۔ لڑکی نے فون پر کہا تھا کہ اگر میں آؤں تو رات کو بیٹے لڑکیا تو وہ زہر کا کمر چلے گی۔ اس رات میری صبح کا کام ایک اور شاعر نے دیا۔ لڑکی میرا انتظار کر رہی تھی۔ اس رات بھی لڑکی کے پکڑوں سے پہلی رات والے طرے خوشبو آ رہی تھی۔ آج بھی طرے وہ خاص خوشبو مجھے اس رات کی یاد دلاتی ہے۔ تھوڑے مختصر میں نے لڑکی کو آخری بار سمجھایا اور کہا کہ میں اب کبھی نہیں آؤں گا۔ وہ لڑکی مجھ سے ناراض ہو گئی تھی۔ شاید اس لیے کہ میں اسے سمجھا رہا تھا کہ اسے اپنے مال باپ کی عزت کا خیال کرنا چاہیے۔ وہ ایک شریف خاندان کی بیٹی ہے اور اس قسم کی باتیں اسے زہر نہیں دیتی۔ جو سکتا ہے کچھ لوگ یہ کہیں کہ مجھے بھی یہ باتیں زیب نہیں دیتی تھیں کہ آدمی رات کو دروازہ چاند نہ کر ایک لڑکی کو نصیحتیں کرنے بیٹھ جاؤں۔ جو سکتا ہے میرے اس فعل کو بزدلی انقیاسی پس مانڈ گی۔ بیٹی انفاقت یا خدا جانے کس کس نسیاتی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتے۔ لیکن میں ہر حالت میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میرے ہاتھوں ایک شریف خاندان کی عزت تباہ ہونے سے بچ گئی۔ ہم جب چاہیں ایک آؤتی پھرتی رنگین متلی کو بچھڑی سے مار کر ہلاک کر سکتے ہیں۔ ہمیں اس کا اختیار دیا گیا ہے۔ مگر ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔

پھر مرید گزرا لاہور کے فیضی بڑی میں فیض احمد فیض کی ساگرہ کی تقریب پر میں نے اس لڑکی کو دیکھا۔ وہ اپنے فائدے کے ساتھ کھڑی کسی پہلی سے باتیں کر رہی تھی۔ اس نے مجھے دیکھ کر خود دوسری طرف پھیر لیا کہ مجھ سے ناراض تھی۔ میں

جاتا ہوں کو وہ مجھ سے کیوں ناراض تھی۔ مگر خدا کی قسم میں ایک لاکھ ایک مرتبہ اس روٹی کی ناراضگی مول لینے کو تیار ہوں۔ لیکن ایک مرتبہ بھی ایسا کام کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا جو اس روٹی کی عزت برباد کر دے۔ ایک وقت آئیگا جب اُسے صوفی ہو گا کہ میں نے اس کے ساتھ جو کچھ کیا تھا کیا کیا تھا اور اُسے مجھ سے ناراض نہیں ہونا چاہیے۔ یہ وقت وہ ہو گا جب اس کی اپنی بچی جوان ہوگی یا اس کی بچی کی روٹی جوان ہوگی یا اس کے بیٹے کی بہو ہو گئے گی۔ پھر اُسے اس حقیقت کا احساس ہو گا کہ ایک عورت سے قائدان کی عزتیں کس طرح وابستہ ہوتی ہیں اور ایک روٹی اوجھی رات کو کبھی غیر محرم کو اپنے گھر کی دیوار چھانسنے کی دعوت دے کر کتنی بیاد شکام کا ارتکاب کرتی ہے۔

کیونکہ ہر دیوار چھانسنے والا میرے ایسا بے وقوف نہیں ہوتا۔ کراچی پہنچ کر شروع شروع میں انشاء کو کافی جدوجہد کرنی پڑی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ وہ ترقی کی منزل میں لے کر تباہ کیا گیا۔ وہ پاک سرزمین کا ایڈیٹر بنا تو مجھے اُس نے پہلے میں جیتنے کے لیے کہا۔ میں نے اُسے دو تین غرضیہ مضمون بھیجے۔ یہ سمرکاری رسالہ تھا اور اس کا دفتر صدر میں کینٹن ٹیرا کے نیچے ایک گلی میں تھا۔ احمد بشیر بھی ابن انشاء کے ساتھ ہی اس رسالے میں تھا۔ ابلاڈر خلیفہ جالندھری اس رسالے کے چیف ایڈیٹر اور مگر ان اعلیٰ تھے ابن انشاء اور احمد بشیر نے پاک سرزمین پر بڑی محنت کی اور اسے بہترین پرچہ بنادیا۔ میں ایک بار کراچی گیا تو ابن انشاء اور احمد بشیر سے پاک سرزمین کے دفتر میں مدنا ہی تھے جاتا۔ ان دنوں احمد بشیر ابن انشاء کا بہترین ساتھی تھا اور دونوں زندگی کی بہتر منزلوں کی طرف دواں تھے۔

کراچی میں قدرت اللہ شہاب صاحب کے ہنگ مشورے اور قریبی صحبت بھی ابن انشاء کو قدم قدم پر پیش رفتی۔ کراچی میں ایک دفعہ ہمیں ادیبوں کے دستغلوں کی مجلس پیش تھی۔ میں اور شفاق احمد لاہور سے اس موقع کے لیے

کراچی گئے۔ یہ لاہور کے ایک ادیب کی زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ اس مجلس میں ابن انشاء صاحب اس احمد صاحب اور جلیل الدین عالی نے بھرپور حصہ لیا اور ان لوگوں نے ذوق دیکھا نہ رات ہمارے ساتھ ساتھ طے طے، مگر گھر گھر کراچی کے ادیبوں اور صحافیوں سے دستخط کروائے۔ قدرت اللہ شہاب انسانی ہمدردی اور محبت و خلوص کی بندھنوں پر نظر آ رہے تھے۔ اُن کے ہاتھ آئی لینڈ کراچی والے گھر میں، ابن انشاء میں اور شفاق احمد دن میں ایک بار ضرور ملاقات کرتے۔ شہاب صاحب کی محبت، خلوص اور ہمان نوازی ساری زندگی یاد رہے گی۔ ہمیں دمشق سے آیا ہوا عراقی مجاہدوں کا مہرہ اور بہترین مکتب کھلتے اور خود چلتے میں دس ڈیڑھ کرکھاتے۔ شہاب صاحب ابن انشاء سے بے حد محبت کرتے تھے اور اس کا احترام بھی بہت کرتے تھے۔ اس کی ہر بات کو بڑی توجہ سے سنتے اور اکثر معاملات میں ابن انشاء سے مشورہ کر لیا کرتے۔ انشاء بڑا صاحب الرائے، ذہین اور ذمہ دار دوست تھا۔ سوائے معاملات محبت کے وہ دیندے ہر مسئلے پر بڑا مناسب مشورہ دے سکتا تھا۔ میری کم بختی دیکھنے کو میں نے زندگی میں سوائے معاملات محبت کے دوسرے کسی مسئلے پر اس سے کبھی مشورہ نہ کیا۔

میں اور انشاء ایک روز دستغلوں کی مجلس کے سلسلے میں ہی "جنگ اخبار" کے دفتر گئے۔ دہال ابراہیم علیس اور شفیق عقیل بے دوسرے اجاب سے بھی ملاقات ہوئی۔ ابراہیم علیس بازو پھیلا کر میری طرف بڑھا۔ "اوسے کیسیا! تو آگیا؟"

شفیق عقیل میں وہی لاہور والی گرجوشتی، محبت اور خلوص تھا۔ انشا و شفاق اور جوش صاحب، شریک تھا۔ ذوق، قریۃ العین، جبر، باہر و مہرور، اعلیٰ صاحب اور کراچی کے ادیب، شاعر اور مافیائی مہنوں نے دستغلوں کی مجلس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ہم لوگ اپنی مجلس کا سیلاب ہو گئے۔ قدرت اللہ شہاب،

ابن انشاء، اشتقاق احمد اور عالی صاحب کو خاص طور پر بڑی خوشی ہوئی۔ یہ ایک انسانی ہمدردی کا کام تھا جس میں ہم لوگ خدا کے فضل و کرم سے مستفیع رہے۔ میں اپنے دوستوں کا آٹ بھی منوں ہوں کہ انہوں نے انتہائی خلوص اور محبت کا ثبوت دیا، دن دیکھا نذرات اور میرے ساتھ ساتھ شہر کی سڑکوں پر پھرتے رہے۔

اللہ تعالیٰ انھیں جزا دے گی۔ آمین !



صدر ایوب خان پاک جمہوریت ٹرین میں مشرقی پاکستان کے دورے پر چلے تو اپنے ساتھ شاعرانہ جہول کی ایک جماعت لے جانے کا بھی فیصلہ کیا۔ اس جماعت میں میرا نام بھی تھا۔ میرے علاوہ ابو الافرغیہ جالندھری، جمیل الدین عالی، ابراہیم حلیم اور امین الٹا بھی تھے۔ ابن انشاء نے کراچی سے مجھے فون کیا۔

”ڈھاکہ ہاسٹس کے لیے تیاری کر لو۔“

مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ میں مارے مشرقی پاکستان کی سیر کروں گا۔ کرناٹکی اور پٹنہ دھبہ ڈال کی سیر کروں گا۔ گندہ ربن میں آدھی رات کو ٹیروں کی دھواڑ سنوں گا اور بلیچ بنگال کے پانیوں کو کاکس بازار کے ساحل کو چڑھتے دیکھوں گا۔ جنوب مشرقی ایشیا کی مرطوب ہواؤں کی ناول کے جھنڈوں میں سرگوشیاں سنوں گا۔ اور سلہٹ کی ڈھانچوں پر چاٹے کے باغات دیکھوں گا۔ بنگال کا جادو۔ بے سیاہ بال اور بڑبڑوں میں لگے تمناؤں کے سفید ٹکڑے۔ جادو بھری باتیں کرتیں سیاہ آنکھیں، خواب آلود ساحلے چہرے اور سمندر کی طرف سے آتی ہواؤں میں جھومتے ناریل کے جھنڈے اور کرناٹکی کے بانجھوں کے درد بھرے گیت — میں بچپن ہی سے بنگال کے جادو کے اثر میں ہوں۔ لگتے جاتے ہوئے جب گاڑی آسنسول پہنچتی تو بچپن شروع ہوجاتا اور میں کھلی آنکھوں سے تالابوں میں کھلے ہوئے کنول پھول اور دھوپ میں پگھلتے

امیل کے درخت اور بنیں کی آہنیوں پر کھسے مرغ پھول اور گٹھاٹ پہ پانی بھرتی ہو رہی
اور چنگڑیوں پر جھگڑتے بچوں کو دیکھا کرتا۔ جب پاکستان بنا تو مجھے سب سے زیادہ
خوشی اس بات کی ہوئی تھی کہ بنگال کا ایک حصہ ہمارے پاس آ گیا ہے اور نارمل
کونوں کے پھولوں اور جڑوں میں بے ترندی کے سیدھے شکوفوں سے میرا اشتہار ڈھلا
نیں، لیکن ہوائی سفرات پہنچا تھا کہ نارمل کی خوشبو میں لاہور تک پہنچ سکتی
تھیں، پہنچا تو جب مجھے ابن الشاء کی زبانی معلوم ہوا کہ میں بھی مشرق پاکستان
جار ہا ہوں تو میں نے نایل کی ٹھنڈی چھاول میں ایک ساؤزی لٹکی کو سمندر کی
لٹ جانتے دیکھا۔ اور اس کے جڑے میں گئے سفید پھولوں کی خوشبو میرے قریب
سے ہو کر گزر گئی۔

پاکستان ہاؤس کی گیلری میں جمیل الدین مالی سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے
تایاکر لاہور سے کراچی جانا ہو گا۔ جہاں سے سٹرک فٹنیشن ہیں، اسی رات کونے کو
ٹھاکر روانہ ہو جائے گا۔ ابو الاثر حفیظ جالندھری کراچی پہنچ گئے تھے۔ ابن الشاء اور
ابراہیم جیس پہلے ہی کراچی میں تھے۔ میں ریل گاڑی میں بیٹھ کر کراچی گیا، سیدھا ابنا
سے جا کر ملا۔ وہ بھی تیار کی میں لگا تھا۔ رات کو ہم ہوائی اڈے پر پہنچ گئے۔ ابراہیم
جیس اور حفیظ صاحب اور قدرت اللہ شہاب صاحب سے ملاقات ہوئی۔ لاؤنج
میں بیٹھ کر ہم نے چائے پی۔ جنوری کا میڈن تھا۔ کراچی میں خضکی تھی۔ ابن الشاء نے
گرم سوٹ پہن رکھا تھا۔ شہاب صاحب نے کہا۔

”ٹھاکر پہنچ کر یہ سوٹ اتارنا پڑے گا! انا ہی! وہاں اتنی سردی نہیں
ہوگی۔ بس خوشگوار موسم ہو گا۔“

ابن الشاء میں پہلی بار ڈھاکہ جا رہا تھا، جمیل الدین مالی بار بار کہہ رہا تھا۔
”اے حمید مشرق پاکستان میں اتنی گرمی نہ پڑے (ہجرہ) اسے کہ تم دیکھ کر حیران
رہ جاؤ گے۔“
ابراہیم جیس بولا۔

”دیکھتے تم لنکا اور سیلون کو بھول جاؤ گے۔ کیا ہو کر کیا ہے تم نے لنکا اور
سیلون کی گرمی ہی بیان کر کے؟“
ابن الشاء نے کہا۔

”اب یہ مشرق پاکستان کے بارے میں کچھ لکھ کر ہمیں پائل کر دے گا۔“
جیس نے کہا۔

”اے حمید کو آنکھوں پر پٹی باندھ کر لے جاؤ۔ ارے تمہیں جہاز میں بڑے
چکر آئیں گے۔ آؤ تمہیں براہڈی پلاؤں۔“
میں نے کہا۔

تو بہ تو بہ۔ خدا وہ دن نہ لائے کہ میں براہڈی کو ہاتھ لگاؤں۔ کیسے!
کیا دنیا میں سچا ہی ختم ہو گئی ہے؟“

شہاب صاحب نے بتایا کہ جہاز میں میری سیٹ حفیظ صاحب کے ساتھ ہے۔
مجھے بڑی خوشی ہوئی اور خوشی کی وجہ سے مجھ پر عرش طاری ہو گیا۔ ابن الشاء میری
خوشی سے اتنی ہوئی صورت دیکھ کر ہنس پڑا۔ میں نے کہا۔
”میں کھڑکی والی سیٹ پر بیٹھا زیادہ پسند کروں گا۔“

ابن الشاء بھٹ بولا۔

”لیکن تم چھلانگ تو لگائیں سکو گے۔ پھر کھڑکی کے پاس بیٹھنے کا فائدہ کیا؟“
میں نے کہا۔

”کم از کم میں آسمان پر چمکتے ستارے تو دیکھ سکوں گا۔“

ابن الشاء ہنس کر بولا۔

حفیظ صاحب تمہیں دیکھنے دیں گے تو دیکھ سکو گے۔“

اُسی رات کے بعد جہاز نے کراچی سے ٹیک آف کیا۔ روشنیوں میں جگمگاتے
کراچی کے ادھر ایک چمکتے لنگایا اور ڈھاکے کی طرف روانہ ہو گیا۔ ابن الشاء مجھ
سے ایک سیٹ چھوڑ کر بیٹھے۔ بیٹھا تھا۔ حفیظ صاحب مجھ سے ہمیشہ کی طرح بڑی

شفقت سے پیش آتے۔ پہلے انہوں نے مجھے مشرقی پاکستان کا حدود وارہ بتایا پھر وہاں کے لوگوں کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ اس دوران میں نے دو ایک بار گول ٹیشے میں سے باہر آسمان پر چلتے ستاروں کو دیکھنے کی کوشش کی لیکن مصیبت یہ تھی کہ ٹیشے میں بھی مجھے اپنا اور حفیظ صاحب کا عکس دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے گردن گھما کر ابن الشاد کی کسی بات کا جواب دینا چاہا تو حفیظ صاحب نے میرے ہاتھ میں ایک مٹائی تھما کر کہا۔

”یہ لو کھاؤ۔ اس شریہ کی بات کا جواب زدو۔ اور ہاں۔ میں تمہیں بتا رہا تھا کہ مشرقی پاکستان کا جھل مندر بن سب سے بڑا جنگل ہے۔“

جہاز جانے کس وقت میرے شہر امرتسر کے اوپر سے گزر گیا۔ میں اس کی ایک بھی روشنی نہ دیکھ سکا۔ میں تو حفیظ صاحب کے ساتھ مندر بن کے جنگل میں غیر کا شکار کیل رہا تھا۔ جہاز کے اندر اعلان ہوا کہ اب ہمارا جہاز دلی کے اوپر سے گزر رہا ہے۔

غالب میرومن اور داغ کی دلی کے اوپر سے گزر رہا ہے۔ اسوقت امراہیم بلیس ہماری سیٹ کے قریب سے گزر رہا تھا۔ اس نے جھک کر میری سیٹ کے شیشے میں سے نیچے دیکھا اور بولا۔

”اے حمید باہر دیکھو۔ ایسے لگ رہا ہے جیسے کسی نے جھللاتے ستاروں کا ڈھیر لگا دیا ہے۔“

میں نے نیچے دیکھا۔ روشنیوں کا ایک ڈھیر دکھائی دے رہا تھا حفیظ صاحب نے بھی میری گردن کے اوپر سے نیچے دیکھا اور چہرہ انہوں نے برائی دلی اور نی دلی کی پانی اور دلی یادوں کی دلچسپ باتیں شروع کر دیں۔ وہ کبھی اپنی ماراں سے نکلنے اور درجے میں گس جاتے۔ وہاں سے نکلنے تو تیس ہزاری سے ہوتے ہوتے تیار پور مولانا جبرائیل صحن حیرت کے گھر پہنچ جاتے۔ مجھے وہ اپنے ساتھ ساتھ لے پھر رہے تھے اور

ہمارا سپر کانسٹیبلشن بجائوں کی فضائوں میں داخل ہو چکا تھا۔ جہاز نے مشرقی پاکستان کا رخ کیا اور حفیظ صاحب چاندنی چوک میں ٹل والے ہندو مٹھائی فروش کی برقی کی تھریٹیں کر رہے تھے۔

”مٹھائی بنانا تو کوئی دلی والوں سے سیکھے جکتے ہیں ٹل والے کی مٹھائی شاہی قلعے میں ہر ماہ حنوں کے حساب سے جابا کرتی تھی۔“

ایک بار نواب دبیر الدولہ کے ال شادی تھی۔ راوی لکھتا ہے کہ.....

جہاز نے ایک لمبا چکر کاٹا اور ڈھکا کر ایئر پورٹ پر چھٹکا چلا گیا۔ ڈھکا کر کے پوائنٹ ڈے کا عمل وقوع کچھ اس قسم کا تھا کہ ہوائی جہاز کو بڑا ہیچیدہ سا چکر لگا کر نیچے اترنا پڑتا تھا۔ جہاز نے مشرقی پاکستان کی سرزمین کو چھو اتو میں حفیظ صاحب کے ساتھ ابھی چاندنی چوک کے ٹل والوں کی دکان پر پہنچا تھا۔ جہاز ایئر پورٹ کی عمارت کے سامنے جا کر زبر گیا۔ رات کے تین یا شاید چار بجے تھے۔ میں ٹل والوں کی دکان سے حفیظ صاحب کے ساتھ ہی اٹھا اور جہاز کے دروازے پر اکو کھڑا ہو گیا۔ میں نے ایک گہرا سانس لیا۔ بجائوں کی خوشبو سب سے الگ تھی۔ پلو پست رہی تھی۔ فضا میں ٹکی ٹکی ٹکی ٹکی کی گھنٹی رنگ کی ٹھنڈی روشنی میں ڈھنسا رہی تھی۔ ایک جھنڈا نظر آیا۔ ایئر پورٹ کی عمارت نے مجھے متاثر کیا۔ ابن الشاد اور جلس میں میرے ساتھ سیزھیال آتے۔ الشاد میری طرف دیکھ کر شرارت کے ساتھ مسکرا رہا تھا۔ حفیظ صاحب میرے ساتھ تھے۔ ہم لاؤنج میں آگئے۔ ہمارا سامان ہل بھر میں کلیئر کر کے ہمارے حوالے کر دیا گیا۔

ایک گاڑی میں بیٹھ کر ہم ایئر پورٹ سے نیو مارکیٹ کے پاس والے ایم پی اے ہوشل کی طرف روانہ ہوئے۔ عالی نے کہا تھا کہ مشرقی پاکستان میں گریزری ہی گریزری ہے۔ میں اور ابن الشاد انھیں چھانڈ کر گریزری یعنی سپر تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ گاڑی کھوکھلا ٹانگوں اور پرانی دروازوں کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ میں نے مالی سے پوچھا۔

بھائی وہ گریزی کہاں ہے؟

مالی نے کہا۔

”میاں! ذرا ایئر پورٹ سے باہر تو نکلنے دو؟“

ابن انشاء نے باہر دیکھ کر کہا۔

”ابھی تک تو ایسا لگ رہا ہے کہ لہیانے شہر سے گزر رہے ہیں۔“

ابراہیم جلیس نے زوردار قبضہ لگا کر کہا۔

”اوتے تو کینہ ہے لہیانے دے دے برصاں!“

ابن انشاء نے کہا۔

”بھئی مالی صاحب! وہ گریزی کہاں ہے آپ کی؟“

”میاں! ذرا روشنی تو ہونے دو۔“

دن کا اجالا بھرتے سے پتلے پتلے ہیں ایم پی اے ہوشل پسچا دیا گیا۔ نوما کیٹ کے سامنے یہ ایک لمبے برآمدوں والی ایک منزلہ عمارت تھی۔ جس میں ایک کے ساتھ ایک کمرے چڑھے ہوئے تھے۔ لمبے جلیس اور انشاء کو ایک کمرہ دے دیا گیا۔ اس میں ٹکڑی کے تختوں والے چمن پٹنگ پرشے تھے۔ جن پر پھر دایاں لمگی تھیں، کمرے میں گرمی تھی، ہم نے پھر دایاں لیٹ دیں اور پٹنگ پر لیٹ گئے۔ خیال تھا گھنڈہ بھر آرام کریں گے، لیکن جہاں ہم تینوں جگہ بوجا ہیں وہاں آرام کہاں۔ جلیس نے لیٹنے نہانے شروع کر دیے۔ ہم پٹنگ پر بیٹھ گئے۔ پٹنگ بڑے کمزور سے تھے۔ ہم تھوڑا سا بیٹے اور وہ تریا رہ بیٹے تھے۔ نچنے بھی بڑے خیمت و نزار تھے۔ جلیس نے کوئی لطیفہ سنایا۔ میں قبضہ لگا کر اچھلا تو میرے پٹنگ کا تختہ ٹوٹ گیا۔ اور میں تختے کے ساتھ ہی فرش پر گر پڑا۔ اس پر ابراہیم جلیس نے ٹھک ٹھکان قبضہ لگایا تو اس کا پٹنگ بھی ٹوٹ گیا اور وہ بھی دھڑام سے فرش پر گر پڑا۔ ابن انشاء بڑے مزے سے جیٹھا ہماری بے بسی پر ہنس رہا تھا۔ ہم دونوں اٹھ کر اُس کے پٹنگ پر آ گئے اور زور زور سے اچھٹنے لگے۔ زیادہ اچھٹنے کی نوبت ہی نہ آئی اور انشاء بھی ہمارے ساتھ

دھڑام سے فرش پر گر پڑا۔

”حرام زادو! ہمارے بارے میں یہاں کے لوگ کیا سوچیں گے؟“

ابھی کے بارے جلیس کی آنکھوں میں پانی آ گیا تھا۔ کہنے لگا۔

”انہوں نے نہیں یہ انوائٹی کھٹوائی پٹنگ کیا سوچ کر دیے تھے کینے؟“

میں نے کہا۔

”چلو مالی صاحب کو جا کہتے ہیں کہ ہمارے پیسے کسی دوسرے کمرے کا بندوبست کیا جاتے۔“

”ہم کمرے سے نکل کر برآمدے میں آ گئے۔ اب جو مالی صاحب کے کمرے کا دروازہ

کھول کر دیکھا تو وہ بھی اڑنے ہوئے پٹنگ پر نیم دراز ایک کتاب پر ڈھننے کی کوشش

کر رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ انہوں نے پٹنگ کو اطلاع دینے سے پہلے کہیں کروٹ

بدلی تھی۔

”بھئی! کسی طرح یہ وقت گزار لو۔ دن چڑھے گا تو سب بندوبست ہو

جائے گا۔“

بہر حال تھوڑی دیر بعد پٹنگ تبدیل کر دیتے تھے۔ اب کوئی لطیفہ ہوتا تو

ہم قبضہ لگانے سے پہلے پٹنگ سے نیچے اتر آتے تھے۔ دن چڑھو آیا۔ سورج کی

روشنی باہر لان میں پھیلنے لگی۔ کیاروں میں ویسے ہی پھول

کھل رہے تھے جیسے پھول میں ٹھکے کے پتھوں میں دیکھا کرتا تھا۔ اگر کوئی فرق

تھا تو بعض اتار کر یہ پھول مزب اور لان پڑھ سے لگ رہے تھے۔ صبح کی روشنی میں

ہلی بار بار دگر بوی عمارتوں کو دیکھا۔ ایک بلڈنگ کی کیدریوں میں کچرے کو

ڈال رکھے تھے۔ ایک ساڑھ والی سالن کی عورت ٹکے کو پانی دے رہی تھی۔ ہوا کا

چھوٹکا آیا اور اس میں تے ہوئے اندوں کی خوشبو تھی۔ لان کے مغزلی کنارے نایل

کے دو درخت صبح کی دھواں جھوم رہے تھے۔ ذرا پرے ایک بڑا سا تالاب تھا جس

کے ساتھ کچھ چھوٹے دریاں دور تک چلی گئی تھیں۔ اس تالاب کی جانب سے جو ہوا

آ

یہی تھی اس میں جھپٹ کی پڑھتی تھی۔ گھاس شبنم سے گیلی ہو رہی تھی۔ میں نے دو تین بلے بلے سانس لیے اور کمرے میں آگیا۔ ابساہیم جلیں مندا تھوڑھوٹے غسل خانے میں گیا تھا۔ اور انشاء پٹنگ پر بیٹھا شیو بنا رہا تھا۔

”کیوں بھی کوئی گریزی نظر آئی؟“

میں نے کہا۔

”گریزی ہے مگر کچھ بیمار بیمار سی ہے۔“

انشاء بولا۔

”مجھے تو ابھی تک یہی محسوس ہو رہا ہے کہ دھیانے میں آگیا ہوں یہاں وہ بنگال کا جادو۔ وہ پٹنم بنگال کہاں ہے؟“

جلیں تو لیے سے منہ گڑھتا ہوا اندر آکر بولا۔

”یار یہاں کے پانی میں تیل کی آمیزش معلوم ہوتی ہے۔“

انشاء بولا۔

”ابھی انہوں نے اس میں سے تیل نہیں نکالا۔“

انشاء خوب دگر دگر کر شیو بنا رہا تھا۔ میں نے اس میں ایک عجیب بات دیکھی تھی کہ وہ دن میں دو بار شیو کرتا تھا۔ یعنی پہلی شیو صبح آٹھ بج کر کرتا اور دوسرا شیو شام کو بناتا۔ میں نے جسے ایک بار کہا تھا۔

”تم مینے میں ساتھ بار شیو کرتے ہو۔ اس اعتبار سے تم شیوا جی ہو۔“

ہم ہنسا دھوکہ کھڑے بدل رہے تھے کہ ایک بنگالی لڑکھاندا آیا۔ اور بولا۔

”صاحب کو کمرے آؤں کو تکرہ؟“

پہلے تو ہم نے ایک دوسرے کو جراتی سے دیکھا۔ پھر اس بنگالی لڑکے کا منہ کھلنے لگے کہ یہ کو کمرے میں لانا چاہتا ہے؟ اب انشاء کہنے لگا۔

”یار یہ لوگ بڑے نہان نواز ہیں اور ہمیں دانت مانجنے کے لیے کو کمرہ۔“

ہیتا گونا چاہتے ہیں۔

جلیں کہنے لگا۔

”مگر ہم تو تھوڑے پیٹ سے دانت مان کر چکے ہیں۔“

ابن انشاء نے کہا۔

”کچھ بھی ہو۔ پڑھ کوئی کاہن لٹا خد ہے کہ ایک بار پھر کو کمرہ کر لیا جاسے۔“

چنانچہ اس نے نوکر سے کہہ دیا کہ نوکر لے آئے۔ محوڑی دیر بعد بنگالی نوکر زرد

کیلون کا ایک گچھا اٹھا کر لے آیا۔ معلوم ہوا کہ وہ ہمیں بنگال کا کیلا کھانا چاہتا تھا۔ کیلا

بڑا میٹھا اور قد آور تھا۔ دیکھتے دیکھتے ہم سارے کیلے کھا گئے۔ اس کے بعد ناشتا کی

اور جمل الدین مالی ہمیں ساتھ لے کر شہاب صاحب کے ہاں آگئے۔ شہاب صاحب کڑی

کی ایک مالیشان کو غسل کے برآمدے میں گاؤں پہننے ہانس کی آرام کرسی پر بیٹھے چائے

پل رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر مسکرائے۔ غیر خیریت لہجہ میں۔

”ناشتا کر لیا آپ لوگوں نے؟“

جلیں ہنس کر بولا۔

”جی ہاں! ہم نے کو کلوں کا ناشتا کیا ہے۔“

”کو کلوں کا ناشتا؟“

ابن انشاء نے جب بنگالی نوکر کا لطیفہ سنایا تو شہاب صاحب بہت منظور ہوئے۔

کو کھنے کے وسیع درمیان لان میں نامیل اور چھالہ کے درخت قطار میں کھڑے تھے

اور کیا ریلوں میں رجھتی گندھاکے سفید پھول سکرا جاتے تھے۔ معلوم ہوا کہ پاکہ جو ریت

نہیں شام کو ڈھاکہ کے کھلا پور ریلوے سٹیشن سے روانہ ہوگی اور چھ روز تک سارے

مشرقی پاکستان میں گھومتی پھرے گی۔ ہم نے شہاب صاحب کے ساتھ کافی کا ایک ایک

کپ پیا۔ اگلے بدوگرام کے بارے میں ہمیں بتایا گیا اور ہم واپس جوش میں آگئے۔

دوپہر کا کھانا کھایا اور دو گئے۔ تیسرے پہر کسی نے دو روزہ کھٹکھٹایا۔ حفیظ صاحب

اندھرت لہنے آئے۔ بڑی شفقت سے بولے۔

”برخوردار وہاں اپنے پیارے مشرقی پاکستان آئے ہو۔ کیا یہاں سو کر وقت

ضائع کر دو گے۔ چلو میرے ساتھ تیس پڑھی لکھا دیا کی میر کر آؤں۔
ابن انشا دے گا۔

حفیظ صاحب! جو لکھا پڑھی ہو چلی ہے اس کی سیر دیکھنے سے کیا
فائدہ بھلا؟

حفیظ صاحب! سکرانے ہوئے انشاء کے پانچ پر پڑھ گئے۔ انشاء طلبی سے
ایک کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ حفیظ صاحب تعجب سے بولے۔

کیا میں کوئی اچھوت ہوں جو تم مجھ سے خود کر بھاگ گئے ہو؟
جیس نے کہا۔

”یہ بات نہیں ہے حفیظ صاحب! دراصل یہ پانچ دو عظیم شاعروں کا
بروجہ برواشت نہیں کر سکتا۔“

ابراہیم جیس نے یہ کہہ کر سیر کو چلنے سے انکار کر دیا کہ اُسے اپنے ایک خزانہ دار
سے ملنے جانا ہے۔

ابن انشا کوئی معقول غرض پیش نہ کر سکا اور میں حفیظ صاحب کے ساتھ سیر
کا لطف اٹھانا چاہتا تھا، کیونکہ یہ میری اُن کے ساتھ پہلی سیر تھی۔ حفیظ صاحب

میں لیم پی اے موشل سے پیدل ہی لے کر پڑھی لکھا کی طرف روانہ ہو گئے۔
سڑکوں پر بڑی رونق تھی۔ موٹر کار، سائیکل راک، بس اور کاریں آ جا رہی تھیں۔

ایک جگہ بیچ کر ہم ٹھک گئے۔ کہا کر ٹیکسی کروا دیتے ہیں۔ حفیظ صاحب اولتے دہری
کے ساتھ مسکراتے۔ اپنے سینے پر انگلی مار کر کہا۔

”میری طرٹ دیکھو۔ اس عمر میں بھی ذرا سانس نہیں بچھولا۔ اونے تم کہاں
کے زمان ہو؟“

مجھے حفیظ صاحب کا گیت یاد آ گیا۔ ایسی خوش بھال ہوں۔ واقف وہ ابھی تک
جوان تھے۔ بلا سبب ہم نے اُدھا ڈھاکہ پھیل پھیر لیا تھا لیکن اُن کے چہرے پر

ذرا ٹھنکن کے اثرات نہیں تھے۔ ہم دوبارہ فٹ پاتھ پر چل پڑے۔ حفیظ صاحب

آگے آگے تھے۔ ہم دونوں اُن کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ ابن انشا نے میرے
کان کے قریب آ کر کہا۔

”بچے! تو نے مجھے بھی مروا دیا ہے۔“

ایک دکان کے باہر کھڑا تھا۔ فٹ پاتھ سڑھی ہاؤس۔ حفیظ صاحب فوراً آگے
جا کر فٹ پاتھ پر چاٹک ٹک گئے۔ وہ پلٹ کر واپس ہوئے اور پورے کو دیکھا،

مسکراتے۔ پھر انگلی سے اشارہ کر کے بولے۔

”نیشنل سڑھی۔ یعنی اپنی پاکت فی سڑھی۔“

میں نے کروہ دکان میں گھس گئے۔ ہمارے کاروں پر پاک جمہوریت ٹرین
کے پتے لگے تھے۔ دکان کے سیلز اینٹوں نے ہماری بڑی آؤ بھگت کی۔ پولیس ٹریفک

حفیظ صاحب صوفے پر تشریف رکھے ہوئے تھے۔ سیلز اینٹوں نے مختلف قسم کی
سڑھیاں دکھائی عروہ کر دیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بے حد قیمتی اور خوبصورت

دیشی سڑھیاں تھیں۔ انہوں نے ہمارے سامنے سڑھیوں کے ڈھیر لگا دیئے۔
حفیظ صاحب بار بار انگلی کھڑی کر کے کہتے۔ وہ دکھائیے۔ یہ دکھائیے اور ہر سڑھی

کو دیکھ کر وہ بڑے خرسے گردن تان کر کہتے۔
”نیشنل پاکستان! پاکستان! نیشنل!“

میں اور ابن انشا بڑے بڑے سے بیٹھے لڑتے بی رہے تھے اور ٹھکن آنا رہے
تھے۔ دکان کا خیال تھا۔ کہ ہم مغربی پاکستان سے آئے ہیں۔ ایک آدھ سڑھی تو

خود خریدیں گے۔ پھر انہوں نے آدمی دکان ہمارے آگے الٹ دی تھی، لیکن حفیظ
صاحب ہمیں ساتھ لے کر اپنے اوٹیشنل پاکستان! پاکستان! کی گردن کرتے

دکان سے باہر آ گئے۔ اب ہم جی اتنی ہمت نہیں تھی کہ پلٹ کر دکان دار کو نہ دکھائے۔
حفیظ صاحب کو پاکستان اور پاکستانی قومی مصنوعات سے جو الیاد محبت

ہے اس میں تو کسی کو شک ابھی نہیں ملتا، لیکن دکان دار آخر کاٹا کر ہوتا ہے۔
بہر حال ہم فٹ پاتھ پر ایک بار چھر رواد ہو گئے۔ کچھ ہی دور میں ہوں گے کہ

اجانم حنیف صاحب ایک بار پھر کھڑے ہو گئے۔ پلٹ کر اوپر دیکھا۔ ہم بھی ڈنگ گئے اور پلٹ کر اوپر دیکھا۔ ایک جزل مرچیت کی دکان کے باہر بانس کی سونچی پر ایک خاکی رنگ کا فرجی سوپر ڈنگ رہا تھا۔ حنیف صاحب نے شہادت کی انگلی سوپر ڈنگ طرف اٹھائی۔ ہم دکان دار سے بوتلیں پینے کے لیے ایک بار پھر تیار ہو گئے۔

”اس خاکی جرسی کو دیکھ رہے ہو انشاء؟“

”جی ہاں دیکھ رہا ہوں۔ وہ بھی مجھے دیکھ رہی ہے۔“

”یہ میرے ملازم کو باسکل فٹ آئے گی۔“

میں بڑا متاثر ہوا کہ حنیف صاحب کو ہزاروں میل دور آکر ہمیں اپنے نوکر کا کس قدر خیال ہے۔

”چلو! دکان دار کے پاس چل کر اس کی حجت معلوم کرتے ہیں؟“

بھوٹے بھالے دکان دار نے ہمیں اپنی دکان کی طرف آتے دیکھا تو بڑا خوش ہوا۔

”شاید سوچ رہا تھا کہ مغربی پاکستان سے سیاح آتے ہیں۔ ہٹ کچھ خریدیں گے بے چارے“

نے اسی وقت بوتلیں منگوائیں۔ کڑسیاں خالی کرادیں۔ حنیف صاحب نے کہا کہ ہمارے

پیارے پاکستان کی بنی ہوئی چیزیں دیکھاؤ۔ اس نے بڑی بڑی قیمتی چیزیں ہمارے

ساتھ کاؤنٹر پر ڈھیر کر دیں۔ ان میں پینے کے ایش ٹرے، بانس کے مکان کشتیاں

بھرے، گولڈن اور خدا جانے کیا کیا تھا۔ ہم نوکر سیوں پر بیٹھے تھنڈی بوتلیں پی رہے

تھے اور اپنی تھکان آتا رہے تھے۔ ابن انشاء تھوڑی تھوڑی دیر بعد میرے کان میں

کچھ کھسک رہا تھا اور پھر ہم دونوں دوسری طرف منہ کر کے بننے لگے۔ حنیف صاحب

نے آخر میں باہر بانس کی سونچی پر لٹکی ہوئی سیل سی پرائی خاکی جرسی کی طرف اشارہ

کر کے فرمایا۔

”اسکی کیا قیمت ہو گی؟“

دکان دار کچھ چپ سا ہو گیا۔ پھر بولا۔

”صاحب! یہ والا جرسی تو کوئی سال کا پرانا ہے۔ اور ہر بارش میں بھی

باہری لٹکا رہتا ہے۔“

حنیف صاحب شکر آئے۔

”پیارے! تم قیمت تو بتاؤ۔ ہم کو بھی اپنے ایک محو نوکر کے لیے خریدنی ہے۔“

دکان دار نے جرسی کی قیمت سواریے بتائی۔ آخر بارہ آنے پر سودا لے ہو گیا۔

دکان دار جرسی کو لانے میں پیشے سے گریز کر رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ نافرمانی سے

زیادہ مہنگا تھا۔ بہر حال ہم لوگ جرسی خرید کر آگے روانہ ہوئے۔ میں نے انشاء سے

کہا کہ حنیف صاحب کی انسانی ہمدردی سے کوئی بھی انگلی نہیں کر سکتا۔ بھلا اتنی دُور

آکر کون اپنے نوکر کا خیال رکھتا ہے۔ اس کے جواب میں ابن انشاء نے میرے کان

میں ایک بات کہی۔ میں نے فوراً اُس کے کان میں کہا۔

”ہو اس کرتے ہو تم۔“

حنیف صاحب نے پلٹ کر ہماری طرف دیکھا۔

”ارے تم کیسے حیران ہو کر پیچھے رہ کر چل رہے ہو۔“

پھر فرمایا۔

”کیسی کیسی مہمان داریاں ہو رہی ہیں تمہاری۔ کتنے مخلص لوگ ہیں یہاں

کے دکان دار۔ بوتل پلائے بغیر تو جانے ہی نہیں دیتے۔“

اب ہم دیالے بوڑھی گنگا پر پہنچ گئے۔ میں نے بڑے بڑے دیاویکھے

جس میں بوڑھی گنگا کے علاوہ زیادہ بوڑھا دیا آج تک نہیں دیکھا۔ ایک سیلا کیلا گندہ

سا بوڑھا دیا زمین پر اوندھے منہ پڑا ہڑی قہقہے سے رہینگ رہا تھا اور اس

کے دلش زدہ سینے پر پچھلے پلائے بال بال والی کشتیاں بڑی شکل سے چل رہی تھیں۔

کھوکھوں سے بنی ہوئی پڑھجوم مارکیٹ میں قسم قسم کی سبزیاں، پھلیوں اور باسی

پھلوں کی بو بھیل بڑھتی تھی۔ ایک جگہ ہم نے تھنڈی داب پی۔ داب والے

کو پیسے دینے کے لیے ہم تینوں نے اپنی اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ جیب سے پیسے نکلنے

میں ہم سب نے خاصی دیر لگائی، لیکن حفیظ صاحب ہار گئے۔ وہ اب کے پیشے انہوں نے ادا کیے۔ کھوکھو مارکیٹ میں گھومتے ہوئے ہم نے ایک جگہ بیٹے تروتازہ بیٹھے کپلے دیکھے۔ حفیظ صاحب نے ایک کیلا اٹھا کر کہا۔

۱۰۔ مشرقی پاکستان کی خاص سوغات کیلہ۔

ہم نے کیلے کھانے شروع کر دیے۔ جب کھا کھا کر تھک گئے تو اپنے اپنے
روان نکال کر منہ پر فینچے بلکہ منہ چپانے لگے۔ اس بار ہم نے اپنی جیبوں میں ہاتھ
ڈالے ہی نہیں۔ اس لیے کہ جیب میں ہاتھ ڈال کر اس کا باہر نکالنا بہت مشکل
ہو جاتا تھا۔ آخر فیصلہ صاحب کی شفقت کام آئی۔ یہاں بھی انہوں نے بل ادا کیا۔
ابن انشاء بہت تیز مزاج تھے کامادی تھا۔ میں اُسے اکثر کہتا رہا۔

یہ باتم اپنی چال سے بیمہ کہنی کے ایجنٹ لگتے ہو۔ بڑی غیر شائسانہ چال ہے تمہاری۔“

لیکن دھاکہ کی سڑکوں پر حفیظ صاحب کے ساتھ پیدل چل چل کر وہ بھی نڈھال ہو گیا۔ اُسکی چال بھی شاعرانہ ہو گئی۔

میں نے پھر ہم تینوں تیار ہو کر ڈھاکہ کے کلا پور مل کے سیشن پہنچ گئے۔
وہاں مشرقی پاکستان کے شاعر ادیب اور صحافی حضرات سے ملاقات ہوئی۔ ان میں
قوی غلام مصطفیٰ، جمیم الدین، فرخ احمد اور وحید فیضہ وی بھی تھے۔ جمیم الدین
کو مشرقی پاکستان کا الیواٹر مصحفیٰ کہا جاتا تھا۔ بڑے عزیز حاضر رہا اور مجھ کو بے جا
تھے۔ اپنے ڈبے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا ڈبہ تلاش کر رہے تھے۔ میں نے انشاء
سے کہا۔

۱۰۔ اس شخص کو ہمارے ساتھ سفر کرنا چاہیے۔

پاک جمہوریت ٹرین پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ سنی ٹیکو ریل کار قسم کی لمبی گاڑی تھی جس کا ہر ڈرفٹ کلاس کا ڈربہ تھا۔ ہم نے چلیٹ دیکھا ہمارے ڈربے میں ہم تینوں کے علاوہ ایک ایسے شاعر کا نام بھی تھا جس کے بارے میں مشہور

تفکر چلتی گاڑی میں اپنا کھام سنانے کے ماہر ہیں۔ ہمارا رنگ اڑ گیا۔
 جیس نے کہا۔

وہ شخص تو ہمارا پشتر اکرم ہے گا۔

ابن النشاع الجولا.

”فکر نہ کرو۔ میں بھی اُسے اپنا کلام سنانا شروع کر دوں گا۔“

جیس نے سرچمیٹ کر کہا۔

”اس کو تو خیر کسی نہ کسی طرح برداشت کر لیں گے مگر تمہیں کیسے برداشت کریں گے؟“

میں نے کہا۔

گھر اور نہیں دوستو! میں ابھی سارا انتظام کیے دیتا ہوں۔ ذرا میرے ساتھ کپارٹنٹ کے پاس تو چلو۔

ہمارے کپارمنٹ کے باہر ہمارے ناموں کے ساتھ اُس شاعر کی چٹ بھی لگی تھی۔ اس کی چٹ ہسپتال کے چھوٹے فریم سے نکالی اور اگلے ڈیے میں جا کر ایک کپارمنٹ میں لٹا کر وہاں سے قری غلام مصطفیٰ کی چٹ اتار کر لیا۔ اسی افسانہ نے جس کو کہا۔

یہ تو اردھ ہی بڑا ہوا۔ پہلے والے شاعر کی کم از کم تفہیم سمجھ میں تو آ جاتی تھی۔ یہ جو تفہیم سناتے گا وہ ہماری سمجھ میں ہی نہیں آئیگی۔ میں نے چٹ فریم میں جھنکا کر کہا۔

اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہم اس مشریف آدمی کو بھگت لیں گے۔

اتنے میں پہلے ولے شاو بغیر بفل میں دابے آن پہنچے۔ یہیں کہہ گشت
کے باہر دیکھ کر اُن کی ہاچھیں کھل گئیں۔

۱۰ واللہ! آپ بھی اس ڈبے میں سفر کر رہے ہیں کیا؟

بھتی واہ! خوب مزار ہے گار۔

وہ اندگس رہے تھے کہ میں نے معذرت چاہتے ہوئے انہیں بتایا کہ ٹرین کنز کوڑنے بعض انتظامی پیچیدگیوں کے باعث ان کی سیٹ آگے کے ڈبے میں بدل دی ہے۔ انہوں نے تعجب کیا اور فرمایا۔

لیکن چارٹ پر تو میرے ڈبے کا نمبر بھی لکھا ہے۔
جلس ہو لا۔

قبل اذہ تو عینک فرمایا آپ نے لیکن کنز کوڑ صاحب کو کچھ تبدیلیاں کرنا پڑ گئی ہیں۔

وہ جڑ اساتذہ بنا کر ہوئے۔

دیہ تو بہت بڑا ہوا۔ آپ ایسے لوگوں کا ساتھ چھوٹ گیا :

وہ بچہ اشائے آگے چل دینے۔ سائنے سے قوی غلام مصطفیٰ چلے آ رہے تھے۔ قوی نے سامان اٹھا رکھا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر انہیں ہاتھوں ہاتھوں چس دیکھ کر مسکرائے۔
اپنے کو ادھر مالوم ہوا کہ ادھر کو ڈبے کا ہے۔

ہم نے اوپر والی برقعہ پر اُن کا ہتھکڑا دیا۔ جمیل الدین عالی دونوں چھوڑ کر ایک چھوٹے کوپے میں براجمان تھے۔ اُن کے ساتھ حمیم الدین سزگر رہے تھے۔ بونج مغرب کی طرف جبکہ رہا تھا کہ ٹرین ریلوے کی سٹیشن سے چل پڑی۔ پہلے شہر کی سڑکیں گزریں۔ پھر جنوبی ریل کی طویل سلسلہ گزرنے لگا۔ اس کے بعد ہرے بھرے کھیت اور ناریل کے جھنڈ اور گھنے درختوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

ابن انشاء نے کہا۔

دیارہ توجج جی گر سیزی ہے۔

واقعی ڈھاکہ کے باہر چلتے ہی سورہ شروع ہو گیا تھا۔ لہذا تے کھیت، گھنے سایہ دار درخت، تالابوں میں کھلے کنول کے سفید پھول اور ڈھلائی چھتوں پر چڑھتی ہوئی ہری ہری پھلیں۔ ناریل تار اور چھاپا کے درخت ریل کے ساتھ ساتھ سفر کر رہے تھے۔ ٹرین میں ڈائینگ کار بھی تھی جس کے کوپن میں دے دیتے گئے تھے۔

بیٹن نا سشتا دوسرہ کا کھانا، شام کی چلتے اور رات کے کھانے کے کوپن۔ ہم نے رات کا کھانا ڈائینگ کار میں بیٹھ کر کھایا۔ انیسویں صدی کی کلاسیکی قسم کی خوبصورت ڈائینگ کار تھی جس کی میزوں پر دلکش میز پوش پڑے تھے۔ قوی غلام مصطفیٰ نے بھی ہمارے ساتھ ہی دال بھات کھایا۔ ان کی ایک مادت میری بکھر میں ڈاکی۔ ٹوٹی چھوٹی اردو میں بات کرتے کرتے وہ اچانک بنگلہ زبان میں بولنے لگے اور دیر تک بولتے چلے جاتے۔ بعد میں انشاء نے مجھے بتایا کہ وہ بنگالی میں اپنی نقلیں سنا رہے ہوتے تھے۔ رات کو انہوں نے اپنی طویل بنگالی نقلیں سنا شروع کر دیں۔ براہیم مجلس ٹوٹتے سنتے بے ہوش ہو گیا۔ ابن انشاء برقعہ پر اوندھا پڑ کر لیٹ رہا۔ میں اکیلا رہ گیا۔ قوی صاحب برابر اپنی نقلیں سنا کے جا رہے تھے۔ یہ وہ مقام تھا جب شاعر اپنے ساتھی سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور وہ درود یار کو بھی شعر سنانے لگتا ہے۔ بالوں کھجلیں کہ سائین اُس کے لیے درود یار میں جاتے ہیں۔

آخر شعر سنانے سے تھک کر ماسے وہ خود ہی سو گئے۔ آدھی رات کو انہوں نے ڈھاکہ مارنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ جڑ کا درود وہ خود ہی بڑ بڑا کر اٹھ بیٹھے اور کہتے۔

”یہ دھاکے کی آواز کہاں سے آئی تھی؟“

دوسرے روز ہم نے آپس میں صلاح مشورہ کر کے قوی غلام مصطفیٰ کی سیٹ ایک بار پھر بدل دی۔ اب ہمارے حصے میں قوی حمیم الدین آئے۔ خیال تھا کہ یہ بے عزت سا سیدھا سا دھما شاعر ہے۔ اپنی نقلیں نہیں سنانے گا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بے عزت ثابت ہوا۔ لیکن اُس نے ایک اور مصیبت ڈال دی۔ جیتی گاڑی میں وہ دونوں ہاتھ باہر نکال کر کھیتوں میں کام کرتے کسانوں کو آوازیں دے دے کر اپنی طرف متوجہ کرتا۔ اور پھر اپنی آواز میں انہیں اپنے شعر سنانا۔ پھر ہماری طرف دیکھ کر غصہ کی میٹھی میٹھی کرتا۔

”یہ میرے لوگ ہیں۔ میں ان کے لیے لکھتا ہوں۔ یہ مجھے جانتے ہیں۔“

میں ان کی آواز ہوں۔

میں نے امین اللہ سے کہا۔

شاعر ہو تو ایسا ہو کہ اس کی زبان ہر کوئی سمجھ سکے! ایک تم شاعر ہو کہ سوائے میرے اور کسی کو شعر نہیں سنا سکتے۔

بڑے بڑے خوبصورت درختوں، باغوں، کھیتوں اور سالنے چھروں والے شہر گزرتے جا رہے تھے۔ رنگ پور، فرید پور، فیض آباد جانے کتنے شہر تھے۔ جن کی رنگین تصویریں آج بھی میری آنکھوں میں ہیں۔ جتنے ان شہروں کو پھر بھی دیکھنا نصیب بھی ہو گا یا نہیں! آج وہ خوبصورت شکلیں یاد آ رہی ہیں۔ جو ان شہروں کے مکانوں، بازاروں، پارکوں اور بوٹوں میں دیکھی تھیں۔ خدا جانے وہ لوگ اندھے کروائیں بھی آسکیں ہوں گے یا وہیں کسی جنگل، کسی بازار، کسی پارک اور کسی باغ میں ان کی لاشیں بٹویوں کے ڈھانچوں میں تبدیل ہو گئی ہوں گی۔ مینا سنی کے فوج سے گزرتے ہوئے میں نے گھنے درخت دیکھے جن کی شاخیں کھنکھانے لگی تھیں۔ بڑے بڑے پھولوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ میں نے جمیم الدین سے پوچھا کہ اس درخت کا کیا نام ہے۔ اس نے کہا۔

دسی بل۔ سی بل۔

میں نے امین اللہ کی طرف دیکھا۔ اس نے سر ہٹا کر کہا۔

شاید اس کا نام دریائی بیٹیا ہے۔

ابو جمیم جلیس نے قہقہہ لگا کر کہا۔

”یہ اس زمانے کا پھول ہے جب یہ سارا علاقہ پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔“

”اب بھی پانی میں ہی ڈوبا ہوا ہے۔“

معلوم ہوا کہ جن درخت کو جمیم الدین سی بل کہہ رہا تھا، وہ اصل میں جنگل کا درخت تھا اور یہ درخت ہمارے باغ جناح میں بھی ہیں بلکہ سن آبا و اجداد میں میرے گھر کے باہل قریب لگا ہوا ہے۔ سیبل الدین حالی جیس کو پے میں سڑک رہا تھا اس

کی ادھر والی برکت پر بھی ایک نیچٹ الفخر شاعر ہوا تھا۔ گلزاری صبح یا رات پور رہوے کی پیش پر لڑکی تو عالی صاحب لال لال آنکھیں ملنے ہمارے ڈبے میں آکر لے دیا۔ یہ مجھے اس شاعر نے ساری رات سونے نہیں دیا۔ ہر دو منٹ کے بعد وہ کچھ اس بھیانک اغاز میں کوٹ بدلتا رہا کہ برکت کی بیچیں نکل جاتیں۔ خدا کے لیے اس کا کچھ کرو۔

گو کیا کیا تھا اس اُس کے نام کی چٹ بھی ہم نے وحید قیصر ندوی کے نام کے ساتھ بدل دی اور دونوں کے ستر بھی موقع پاکر تبدیل کر دیئے۔

گو لوندو جانے کے لیے ہمیں ریل چھوڑ کر ایک جگہ میٹر میں سوار ہونا پڑا۔

اس ٹیکر کا نام اوسٹری تھا اور ایک چھوٹا سا صاف ستھرا بجری ہما تھا۔ یہاں بھی ہم کنوئں نے ایک ہی کبیل لے لیا۔ ہمارے ساتھ یہاں بھی جمیم الدین تھے۔ کبیل بڑا چمکیلا روشن اور شفاف تھا۔ ہر شے قریب سے لگی تھی۔ میٹر سارا دن دیا نے ہمارا میں چلتا رہا۔ شام کو بڑی خوشگوار رنگ ہوا چلنے لگی۔ عرشے پر ایک جگہ لڑکی کی جھٹ کے نیچے گول میز کے ارد گرد آرام کر سیاں لگی تھیں۔ ہم یہاں بیٹھ کر کافی پینے لگے۔ رات کا کھانا ہم نے ڈائینگ ہال میں بیٹھ کر کھایا۔ کچھ دیر بیٹھے بازی کی اور ہر سو گئے۔ اچھا افشا کے دانت میں پھر سے درد شروع ہو گیا تھا۔ سونے سے پہلے اس نے نیم گرم پانی سے طرا سے کئے۔ دیسی دوائی کی ایک شیشی نکال کر روٹی سے دانت میں دوائی لگا دی۔ اس کی گال ایک طرف سے سوچ گئی تھی۔ آدھی رات کے بعد کسی وقت میری آنکھ کھل اور میں عرشے پر اُٹھا۔ میٹر بڑی ہموار رفتار کے ساتھ دریا میں بہا چلا جا رہا تھا۔ دودھ اندھے میں ماہی گیری کی کشتیوں کے بادلوں کے سامنے نظر آ رہے تھے۔ خشک ہوا میں دریا کی خوشبو تھی۔ ٹھنڈی اور مرطوب خوشبو۔ جو جنوب مشرقی ایشیا کی خوشبو تھی۔ میں دیونگ عرشے کے جنگل سے لگا دریا کی لڑل کو دیکھتا اور اُن جنگلوں دیاؤں کے بارے میں سوچتا رہا جہاں سے کبھی میں گزرا تھا۔ ان صورتوں کو یاد کرتا رہا۔ جنہیں میں نے کبھی بڑے قریب سے دیکھا تھا اور

جواب دقت کی دھند میں گم ہو چکی تھیں۔

صبح سویرے شہر گولنڈو کی گھاٹ پر ٹہک گیا۔ ہمارے پیچھے پیچھے صدر ایوب کا خاص منیر میری اینڈرسن چلا آ رہا تھا۔ گولنڈو میں بھی ایک جہر تھا جہاں صدر نے لوگوں سے خطاب کیا۔ یہاں سے ہم بھر ایک بیل گاڑی میں سوار ہو گئے اور آگے گورنہ ہوئے۔ واپسی پر پھر گولنڈو سے اپنے شہر میں آئے اور خدا جانے کون سے گھاٹ کی طرف چل پڑے۔ سارا دن ہمارا منیر صدر کے شہر کے آگے آگے دیاؤں میں سفر کرتا رہا۔ شام سے کچھ پہلے وہیں بتایا گیا کہ سوٹ و سپرہ پن کر تیار ہو جاؤ کیونکہ آج شام صدر اپنے شہر کے سرے پر محلہ ملکی اور سرکل نامہ نگاروں سے ملاقات کریں گے۔

شام کو شہر، پولیس اور انشاء سوٹ پہن کر صدر کے شہر پر آ گئے۔ ڈوبک پر ایک طرف ملی میٹر پر انوار و اقسام کی ام المہاش کی بوتلیں روشن ہوں ہیں چمک رہی تھیں۔ بعض ملکی اور اکثر غیر ملکی صحافی شغل سے میں مشغول تھے۔ مجھے پاک جمہوریت ٹرین کی ڈائنگ کار کے شیکہار گلشن صاحب کا خیال آ گیا۔ وہ ام المہاش کے بڑے رہنما تھے۔ سوچا اس بستی گولنڈو سے کیوں نہ ان کے لیے ایک سوچ بچ بھر کرے چلوں۔ میں نے انشاء سے کہا۔

یار میں گلشن صاحب کے لیے یہاں سے سکاچ کی ایک بوتل اڑانا چاہتا ہوں؟

ابن انشاء نے مجھے سرزنش کرتے ہوئے کہا۔

شرم کو دور ایسی کیفی حرکت سے باز رہو۔

میں نے شرم جزو کی مگر اس حرکت سے باز نہ آیا۔ اب میں بوتل اڑانے کی سکیم پر خود کرنے لگا۔ اچانک کیا دیکھتا ہوں کہ کراچی کے ایک اچکن پوش بزرگ شاعر ام المہاش کی ملی میز کے کونے پر ہاتھ رکھے ذرا بیڑھے ہو کر ایک صاحب سے باتیں کر رہے ہیں۔ ایک طرف کو جھنگنے سے ان کی اچکن کی جیب کا منہ پورا کھلا

تھا۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ بے چاری جیب العطش العطش پکا رہی ہے اور ام المہاش سے اپنی پیاس بجھانا چاہتی ہے۔ میں نے ابن انشاء کو ایک طرف لے جا کر کہا۔

اگر میرے بار ہو تو میرا ایک کام کرو۔ یہاں سے جلتے جلتے سیدھے

اُس میز تک جاؤ اور سامنے پڑی ہوئی بوتلوں میں سے کوئی ایک

بوتل اٹھا کر اُس بزرگ شاعر کی اچکن کی کھل ہوئی جیب میں

ڈال دو۔

ابن انشاء نے کالوں کو ہاتھ لگائے۔ مجھے بڑا بھلا کہا لیکن میری جتنی گن کی داد دیجیے کہ میں نے اس پختہ کار نامہ کو آخر ام المہاش کی میز کی جانب روانہ کر دیا۔ میں دھڑکھڑا اُسے میز کی طرف جاتا دیکھ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ابن انشاء میرے پاس گیا اور بائیں شین انداز میں اُس نے میز پر سے بوتل اٹھائی اور اچکن پوش بزرگ شاعر کی اچکن کی جیب میں ڈال دی۔ اُن صاحب کی جو حالت ہوئی میں اُسے آج تک نہیں بھلا سکا۔ وہ چونے بلکہ پنجابی میں جلتے — جیب کو دیکھا پھر انشاء کو دیکھا۔ ساری باتیں بھول گئے اور تیزی سے جیب پر ہاتھ رکھے گاڑی کے تختے پر سے گزر کر اور سڑج شہر کے سرے پر آ گئے۔ میں اُن کے پیچھے پیچھے تھا۔ میں نے قریب جاتے ہی ادب سے سلام کیا اور ہاتھ بڑھا کر اُن کی جیب سے بوتل نکال لیا۔ وہ تیزی سے پڑھا کر مجھے اور ابن انشاء کو کہنے لگے لیکن

کتنے نہیں ہیں میرے لب کہ رقیب

گالیاں کھا کے بے مزہ ہوا

میں بوتل کر کے اندر چھپا سیدھا کہیں میں آ گیا۔ یہاں آ کر جودھکا تودہ ٹاٹر کی چٹنی کی بوتل تھی۔ ہاتھ مجھے بھالے انشاء کی سادہ ولی ہاتھ کہہ بنتا اتارنے لگا۔ میں نے؟ — تمام کو میں نے دیا پر پانی تھے لیجھا تھا وہ سنی بھریت لے کر آ گیا۔ اتنے میں ابن انشاء اپنے کارنامے پر بڑا غرور غرور کر رہے تھے۔

”کہنے! میں نے یہ کام صرف تمہارے لیے کیا تھا۔“
میں نے ٹانگی کی چٹنی کی بوتل کا ڈھکن کھولا اور چٹنی کا ایک ڈبل پیگ اس کے
سر پر انٹر میں دیا۔

ٹرین چٹا کالنگ پہنچ گئی، صاف سحر اور خوبصورت شہر تھا۔ سڑکوں کے نشیب و
فرزاں اور روگڑکی پہاڑیوں کو دیکھ کر مجھے کوہ مری یاد آ گیا۔ بہرہ بہت تھا۔ کچاؤں
کی سرخ چھتیں ڈھلائی تھیں۔ گھروں کے آنگھوں میں پیپے، نایل، تار اور آم کے گھنے
درخت سراٹھاتے کھڑے تھے۔ کوٹلیوں کی بیرونی دیواریں بارشوں کی وجہ سے سیاہ پڑ
چکی تھیں۔ بازار کھلے کھلے تھے۔ بائیں اور بید کا لڑچر بڑا خوبصورت تھا۔ مسجدیں
بڑی پر شکوہ تھیں۔ ہندو گاہ کی سیر کر گئے تو دیکھا کہ ایک جہاز رنگنوں سے لگرجی
بد لگا ہے۔ مجھے رنگنوں میں گزارا ہوا آخری صبحت زمانہ یاد آ گیا۔ ایک مسافر سے میں
نے پوچھا۔

”کیوں جہاز رنگنوں کی فریئر مشینٹ پر سو رہی؟ مسجد اب بھی ویسی ہی
خوبصورت ہے؟ سہارک مشینٹ میں ترکی بوتل اب بھی چلتی ہے؟ اور
کولی بیگ کوڑا کی میٹر جیوں پر اب بھی بری یو کیاں کولی کے پھول چٹی رنگہ
میرا دل چاہا کہ جب یہ جہاز دایس رنگنوں کی طرف روانہ ہو تو میں بھی اس میں
سوار ہو کر چلا جاؤں اور کولی بیگ کوڑا کی میٹر جیوں پر کولی بچنے والی بری یو کیاں
سے جا کر پھول خریدوں اور گوتم تھو کے چروڑوں میں اپنی کھلدا نشاد میرے ساتھ
ساتھ تھا اور بار بار یاد دلارہ تھا کہ شام کا کھانا میٹھو صاحب کے ہاں ہے۔ ان میٹھو
صاحب کا نام میں بھول گیا ہوں۔ بڑے وضع دار، خوش اخلاق اور خاندانی رشتہ تھے۔
پابند صوم و صلوٰۃ۔ بڑی محبت سے انہوں نے ہمیں اپنے ہاں کھانے پر بلایا تھا۔
ہندو گاہ پر غیر ملکی جہاز بھی کھڑے تھے جن کے ستوروں پر ان کے جھنڈے چٹا کالنگ
کی خوشگوار ہوا میں لہرا رہے تھے۔
شام کو ہم نے صاحب کے بھگے پر گئے۔ ان کا سینہ بھلا شہر سے باہر ایک جیلے

پر تھا۔ ہندی گاڑی دو تین چکر کاٹ کر ان کے بھگے کے پورے میں داخل ہوئی۔ وہ
خود برآمدے میں موجود تھے۔ خندہ پیشانی سے ملے اور میں ڈرائیگ روم میں لے گئے۔
ڈرائیگ روم قیمتی قالینوں اور بہترین زوارات سے سجا ہوا تھا۔ کونوں میں مہری گلداز
میں استوائی چھولنگ سگوار رہے تھے۔ شہر کے کئی ایک معززین اپنی بیگمات کے ساتھ
آشریف فرما تھے۔ ایک لاکر بارونیم کی چٹنی لے کر آ گیا۔ اُس نے بڑے ادب سے ایک
بیگ صاحب کے سامنے بارونیم رکھا۔ انہوں نے سر پر ساتھی کا تھوڑا دیا۔ بارونیم
پر ہاتھ رکھا اور بڑی شریف گھڑیوں آواز میں علامہ اقبال کی ایک نظم تو فرم سے سنائی۔
”بانگ درا کی ایک آسان سی نظم تھی۔ ایک صاحب نے بہادر شاہ ظفر کی غزل تو فرم
سے سنائی۔ اب ہمارے ساتھی شراک باری تھی۔ شہاب صاحب نے ابن انشاء کی طرف
اشاہہ کر کے لو کر سے کہا۔

”بارونیم انشاد کی کے سامنے رکھ دیں؟“

ابن انشاء نے مسکراتے ہوئے کہا۔

خوانین و حضرات! میں قوال بعد میں کروں گا۔ لی الحال ایک نظم تحت اللفظ
پیش خدمت ہے۔“

میں نے اور تینوں نے بے حد اصرار کیا کہ ابن انشاء کو بارونیم کے ساتھ نظم
سنائی جائیے۔ لیکن وہ صاف بچ کر نکل گیا اور اس نے اپنی ایک نظم تحت اللفظ
سنائی۔ مجھے وہ نظم یاد نہیں رہی۔ اس کے بعد عدلی صاحب نے اپنے دو کٹھ دوہے
تو فرم سے سنائے اور غرضیں مفید صاحب نے اپنے کام بلاغت نظام نایاب فرخ احمد
قوی غلام مصطفیٰ اور حمید الدین نے اپنا بنگال کلام پیش کیا۔ قوی غلام مصطفیٰ کی نصیحت
بہت پسند کی گئی۔ میٹھو صاحب بنگال نہیں تھے۔ ان کا تعلق نایاب کھنٹو شہر سے تھا۔
ان کے ہاں میں تہذیب اور ادب کی شاندار جھلک دیکھنے کو ملی۔ ڈھاکہ خال ہوا تو خدا
ہالے کیوں میٹھو صاحب کا خیال آ گیا۔ ان کے پٹا کالنگ شہر واسے بھگے اور خوبصورت
ڈرائیگ روم اور ان کی پابند صوم و صلوٰۃ خوانین کا خیال آ گیا۔ سچا خدا جانے ان پر

کیا قیامت گزر گئی ہوگی! اللہ کرے کہ وہ لوگ بیزیت ہوں۔

رات گہری ہو چکی تھی کہ ہم لوگ گاڑیوں میں بیٹھ کر واپس ہوئے۔ اُن کے لان میں رات کی رانی کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ پارک میں کھڑے بیٹھ صاحب سفید براق لباس میں بیوس اٹھ بلا جاکر ایک ایک کو رخصت کر رہے تھے۔ ان کی زبان نڈی اور اخلاق سے ہم بہت متاثر ہوئے۔ ہم قرین میں آکر اپنی اپنی سیٹ پر لیٹ گئے اور دعوت کے بارے میں اظہار خیال کرنے لگے۔ تقریباً ہر شہر میں ہماری دعوتیں ہوتی تھیں جس کی وجہ سے ہمارے پاس کھانے کے کوپن بچے جاتے تھے۔ میں نے تو ڈیڑ گھنٹہ کار کے گفتگو صاحب کے پاس اپنے کھانے کے سامنے کوپن بچا ڈالے اور اس کے بدلے اُن سے ملحقہ قسم کی مشروبات خرید لی تھیں۔

رات ہم نے اپنی قرین میں بسر کی۔ دوسرے روز صبح کو میں رانگھاسٹی کے لیے روانہ ہونا تھا۔ یہاں کپتانی قدیم زیرِ قیصر تھا اور پھر قبائل کے سردار راجہ تری دیو نے کی جانب سے صدر ایوب کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا جانا تھا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ ہماری گاڑیاں سندھین کے کھنے جنگل سے گزرنی کی قرین بہت غرض ہوا۔ ناشے کے بعد ہم گورنمنٹ ہاؤس پہنچ گئے۔ یہاں سے ہمارا قائد رانگھاسٹی کی طرف روانہ ہونا تھا۔ کچھ ملاقات کاروں تھیں۔ کچھ مائیکرو بسیں تھیں۔ مجھے اور انشاؤں کو ایک مائیکرو بس میں جگہ ملی۔ میں کھڑکی کے ساتھ ٹک کر بیٹھ گیا۔ قائد پہل پڑا۔ چٹا گانگ کافراؤں حلقہ شہر سے زیادہ خوبصورت تھا۔ سن اور دھان کے کھیت جھری کی دھوپ میں لہلہا رہے تھے۔ سڑک کے ساتھ ساتھ ٹیلی اور تاریل کے درخت صبح کی ہوا میں لہرا رہے تھے۔ تالابوں میں کڑوں کے پھول کھلے تھے۔ کوئی گھنٹہ ڈیڑ گھنٹہ کی مسافت کے بعد پہاڑی حلقہ شروع ہو گیا۔ اس کے بعد ہماری گاڑیاں ایک جنگل میں داخل ہو گئیں۔ بڑا گھنا جنگل تھا۔ میں نے کھڑکی کا شیشہ اتار رکھا تھا۔ جنگل کی طرف سے ٹھنڈی مٹی کا مٹی ہوا آ رہی تھی۔ جس میں ساگران کے درختوں کی جھک تھی سڑک چھوٹی سی تھی اور پہاڑی کے پہلو سے گزر رہی تھی۔ ابن انشاؤں اور میں بائیں

جہاں کر رہے تھے اور سچل کے درختوں کو بھی دیکھ رہے تھے۔

• یاد اگر اس وقت یہاں سے شیر نکل آئے تو کیا ہو؟

• وحید قمر ندی اگل سیٹ پر بیٹھا تھا۔ گردن جھکا کر منکراتے ہوئے بولا۔

• منہ باری رات یہاں ہانکا کرنے والوں نے شیروں کو بھگا دیا ہے۔ آپ

بالکل فکر نہ کریں؟

انشائی نے کہا۔

• شیروں کو معلوم ہے کہ امراہیم جیس ہمارے ساتھ جا رہا ہے۔ اس لیے

وہ ہر گزہ گز اور کارخ نہیں کریں گے؟

• وہ کیوں؟

• اس لیے کہ شیروں کو معلوم ہے کہ اگر ہم آئے تو ہمیں اپنا سیدر آباد کی

والا پلوڑا تاثر سنانا شروع کر دے گا۔

اس نائنے میں جیس کے دکن والے رپورٹائر کی بڑی دھوم تھی۔ ان سفلوں میں

کہ وہ بہت طویل تھا۔ جنگل سے نکل کر گاڑیاں ایک بار پھر پہاڑی راستے پر سحر کرنے

لگیں۔ دو پہر کو ہم لوگ رانگھاسٹی ریٹ ہاؤس پہنچ گئے۔ جلدی جلدی سناٹا دھو

کر لباس خشک کیا۔ کھانا کھایا۔ چائے پی اور گورنمنٹ ہاؤس کے لان میں پہنچ گئے۔

یہاں شایانے لگے تھے۔ سیٹج جی ہوئی تھی۔ صدر ایوب تشریف لائے تو لوگوں نے

تائیاں ہانکاں ان کا خیر مقدم کیا۔ مہاراجہ تری دیو نے سہا سنا پیش کیا۔ پھر اپنے

ملازموں ایکڑ کے اُس علاقے سے دستبرداری کا اعلان کیا جہاں کپتانی ڈیم تیار ہو رہا

تھا۔ انہوں نے سارا علاقہ پاکستان کی ترقی و خوشحالی پر قربان کر دیا تھا۔ انہوں

نے صلہ کار اپنی خاص خاندان کووار بھی پیش کی۔

اس کے بعد چکر قبیلے کی عورتوں نے رقص کیا۔ ان عورتوں کے رنگ گوجے اور

نقش چٹے تھے۔ بڑی خوبصورت اور صحت مند عورتیں تھیں۔ میں نے ابن انشاؤں سے کہا۔

• جی جانتا ہے اس علاقے میں شادی کر کے بس جاؤں؟

ایک ڈرائیور جاری بات سن کر پنجابی میں بولا۔
 "ایسا نہ کہو بھابی! میری طرف دیکھو۔ یہاں سیر کو آیا بھٹلہ اودھ میں رہیں
 سے اسی جگہ پڑا ہوں۔ بنگال کا جادو چل گیا۔ خدا بچائے بنگال کے
 جادو سے۔"

وانکا متی ریلٹ ہاؤس کے لان میں کھڑے ہو کر دم سے دریائے کرناٹلی کا نظارہ
 کیا جو بہت نیچے وادی میں بہہ رہا تھا۔ اس کے دوسرے کنارے پر مسند بن تھا جہاں
 بانس اور نیل کی بڑھن چھاؤں میں درختوں والے شیر آسام کو رہے تھے کرناٹلی
 میں کچھ بادبانی کشتیاں چلی جا رہی تھیں۔ ان کے بادبان ہوا میں پھوٹے ہوئے تھے۔
 مجھے یہاں بنگالی گیت یاد آ رہا تھا۔ ہرنی کا گیت۔ ایک ہرنی شکاری کے تیرے
 زخمی ہو کر گر گئی ہے اور شکاری سے زیادہ کرتی ہے کہ اسے بھائی! چھاتیوں کے سوا
 میرے مدد کے جسم کا گوشت کاٹ کر لے جا۔ ابھی میرا بچہ چھوٹا ہے۔ اسے میرے
 دودھ کی ضرورت ہے۔ جب میرا بچہ بھوک سے تڑپ تڑپ اٹھے گا میں اسے کھانا کھانے
 کو روئے گا۔ تو اس کی پکار دیوتاؤں کے دلوں میں بھی شکاف ڈال دیگی۔ آہ اکیسے تھکے
 تیرے قتلے گھائل کو دیا مجھے۔ زہری بھر کر اس کا چاندہ سا کھڑا۔ زہری
 بھر کر اسے دودھ پلایا۔ زہری بھر کر اس سے پیادہ کر پائی۔ کیسے تھکے تیرے گھائل
 کو دیا تو نے اوجھائی تیرا انداز! —

ہرنی کے اس گیت میں دیکھ بھری انسانیت کی پکار رہی تھی۔
 محمود ادریسے ہیں انسانوں کی چٹا تھی۔ آج کا انسان بھی شکاری کے تیرے
 گھائل ہے اور خون میں ڈوبا نہ میں پر پڑا اپنی موت کا انتظار کر رہا ہے۔ اسے اپنے
 بچے یاد آ رہے ہیں۔ وہ شکاری کے ظلم کا شکار ہے مگر شکاری کو بھائی تیرا انداز
 کہہ کر مخاطب کر رہا ہے۔ تیسرے پہر ہمارا قافلہ واپس چٹا گانگ کی طرف روانہ ہوا۔
 واپس پر ایک دیبا پرستے گزرتے ہوئے مجھے دیبا کنارے غازی بدوشوں کے جھونپڑے
 نظر آئے اور مجھے غازی بدوشوں کا وہ گیت یاد آ گیا جو مجھے قوی جیم الدین نے ڈھاکہ
 میں سنا یا تھا۔

"الوداع! میرے دوستو الوداع!

میرا گھر دریائے پدما میں ہے۔

میں پھیلیاں پکڑ کر اپنی روزی لکاتے ہیں۔

ہماری خوشی کی کوئی حد نہیں۔

میں ان قیمتی پتھروں کا بھی کاروبار کرتے ہیں۔

جب نہیں ہم جان کی بازی لگا کر

ذہریے ساپوں کے پلوں سے ابر نکالتے ہیں۔

ام دیا کے ایک کنارے پر کھانا پکاتے ہیں۔
اور دوسرے کنارے پر اُسے کھاتے ہیں۔

ہمارا کوئی گھر نہیں۔

ساری دنیا ہمارا گھر ہے۔

گاڑیاں دریا کے کنارے گزرنے کے بعد جنگل میں داخل ہو گئیں، ہرے جبرے
بائس کے گھنے جھنڈ، اس گاون کے ذخیرے، کیلے اور پھل کے درختوں کی قطاریں اور
درختوں کے تنوں سے پٹی جوتی جنگلی مینیں۔ سارے جنگل میں سبز، تختہ انداز
سا پھیلا تھا۔ شام ہونے سے پہلے ہم لوگ چٹا گانگ پہنچ گئے۔ آدھی رات کو یہاں
سے ہماری تین سبٹ کی طرف روانہ ہو گئی۔ سبٹ۔ چلتے کے باغوں کا چھوٹا
صاف سترا شہر۔ آسام کی سرحد پر رکھا ہوا چلتے کا ہنر بیار!

ساری رات گاڑی چھوٹے چھوٹے گاؤں تھبے تھبے چھوٹی سفر کرتی رہی۔

دوسرا دن بھی سفر میں گزر گیا۔ اتنے شہر نہیں آتے جتنے دریا گزر رہے تھے۔ بائس
کے پل والی نہریں، دھان اور برٹ من کے کھیت۔ آم اور کیلے کے گھنے باغوں کے
نیچوں بیچ جانے والی پگڈنڈیاں اور ان پر سے گزرتی سائلی سائلی کاسی مائیلی
والی جنگلی دیہاتی ٹوٹیں، جاگرمیں اٹھانے کے تالاب کی طرف جاتیں، معصوم جنگلی بچے
جو گاڑی کو آتا دیکھ کر کھیتوں میں کھڑے ہو جاتے اور دوسرے ہاتھ پلانٹ شروع
کر دیتے۔ گاڑی دریا کے کنارے پر سے گزرتی تو پانی کی پرشکون نیل سطح پر کشتیوں
کی قطاریں دفن دکھائی دیتی۔ کچھ ریل چھتوں کے اوپر کیلے اور سٹریٹس کے
درخت لہرا رہے تھے۔

پھول باڑی، یعنی زریہ پور، کو سیلا۔ پرانے مکانوں کی بارش زدہ کالی
دیواریں۔ چھوٹے چھوٹے دروازے۔ لمبی کھڑکیاں۔ آٹھن کی دیواروں کے اوپر سے
جھانکتے چھوٹے بھرے درخت۔ سبز بائیسوں کی جھونپڑوں میں گم جوتی، جوتی پگڈنڈیاں
پانی سے بھرے ہوئے سبز تالاب اور کنول کے پھول اور پرانے تالابوں کی کالی گلی سڑکیں

کی دروازوں میں آگئی لمبی گھاس۔ میں کھڑکی کے ساتھ ٹکا باہر دیکھ رہا تھا مجلس
اور پروانہ پر تھکے پر سوراہا تھا۔ این انشا، اپنی سیٹ پر بیٹھا گھر خلو کھنے کی کوشش کر
رہا تھا۔ تین کسی شہر کے قراج سے گزر رہی تھی۔ میں نے ایک بچی کو دیکھا۔ وہ
اپنے مکان کے آگین میں کھڑی تھی۔ اس نے ایک جھاڑی کی پٹنی کو جھکا کر پھول
توڑے اور نہاگ کر ماند چل گئی۔

میں اُسے دیکھتا رہ گیا۔ کہاں کہاں لوگ اپنے اپنے گھروں میں اپنی اپنی
زندگیاں بسر کر رہے ہیں۔ جس کمرے میں یہ لڑکی بھاگ کر گئی ہے وہاں مزور ایک
پنگ بچھا ہوگا۔ اُس پر پھلدار چادر پڑی ہوگی۔ تپائی پر ایک گلدان رکھا ہوگا۔
پتی وہ پھول جا کر گلدان میں لگا دے گی۔ پھر رسوئی سے کسی عورت کی آواز آئے
گی اور وہ تپائی دیدی کچر رسوئی کی طرف دوڑ جائے گی۔ ایک سڑخ ہندیا والی
جنگلی لڑکی اپنے مکان کی کھڑکی کا آدھا برٹ کھولے ہماری تین کو گزرتا دیکھ
رہی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں دونوں ہاتھ جوڑ کر اُسے شکار کیا۔

کیا کھڑکی تین کے ساتھ نہیں جاسکتی؟

اب اس سڑخ ہندیا والی لڑکی کو پھر کبھی دیکھنا نصیب نہیں ہوگا۔ پھر کبھی
اس سائے خاموش چہرے کے درخ نہیں ہوں گے۔ وقت کے سمندر میں ایک صحن
پھر ہل جبرے کے بے اُبھر کر ڈوب جاتا ہے اور پھر کبھی دکھائی نہیں دیتا۔ شاید
کبھی بڑھاپے کے آخری موڑ پر دوبارہ ملاقات ہو جائے، لیکن پھر ایک دوسرے کو
کوئی بھی پہچان سکے گا۔ کوئی ایک دوسرے سے نہیں کہے گا کہ میں نے تمہیں پہلے
بھی کہیں دیکھا ہے!۔

دیو داس سچا تھا جس نے آخری بار اپنی پاروتی کو دیکھا اور مر گیا۔ مجھے
برودان کاشیشن یاد آگیا۔ کلکتے کے قریب پریشین آباد ہے۔ یہاں سے ایک کچی
چھوٹی سی سڑک کھیتوں کھیت کسی زمیندار کی پرانی حویلی کو جاتی ہے یہاں چھالے
اور تالاب کے درخت۔ تلج جنگال کی طرف سے آنوالی مرطوب ہواؤں میں جھڑ مار تے

ہیں۔ مدت ہوئی اس کچے راستے سے رات کو ایک بیل گاڑی گزری تھی۔ اس میں ایک قریب المگ بنگالی نوجوان سر جھکاتے بیٹھا تھا۔ اس کا نام دیو داس تھا۔ وہ اپنی محبوبہ پاروتی سے زندگی کی آخری ملاقات کرنے جا رہا تھا۔ گاڑی بان دھیسے شرڈوں میں گا رہا تھا۔

رنی کی نگریا آئے ہے
نرپین کو بھرا پائے ہے
رات اندھیری رستہ دُور
تھک کر ہوا سناں چوڑ
دھیرے دھیرے تیرا جیون
دوپک بھجنا جاتے ہے
رنی کی نگریا آئے ہے

(آواز دھنوی)

آسمان پر شام کی سرخ چھیل رہی تھی کہ گاڑی سبٹ پہنچ گئی۔
میں اور انشاء سبٹ کے بانڈروں میں سیر کرنے نکل آئے۔ کھلے کھلے کشادہ بانڈر۔ دکانوں میں روشنیاں ہو رہی تھیں۔ ہوا میں قسم قسم کے پھولوں کی مہک رچی ہوئی تھی۔ کچھ لڑکیاں بالوں میں سفید پھول لٹکانے گزرتی گئیں۔ ایک دکان سے کسی عورت کے بنگال گانے کی دل گداز آواز آئی۔ یہ گراموفون ریکارڈوں کی دکان تھی۔ ہم دکان میں داخل ہو گئے۔ دکاندار گراموفون کے پاس کھڑا اُسے چال سے رہا تھا۔ ہم کاؤنٹر کے پاس کھڑے بنگالی گیت سنتے رہے۔ گیت ختم ہوا تو میں نے دکاندار سے گانے والی کا نام پوچھا۔ اُس نے شکر کر کہا۔

• اُپکاسین •

ابن انشاء نے سر ہلکا کر کہا۔

• بہت خوب آہیت خوب احاطہ لہا کا کوئی ریکارڈ ہو گا؟ •

• جی۔ کیس کا ریکارڈ؟ • دکاندار نے جھک کر پوچھا۔

• خیر کوئی بات نہیں۔ آپ نہیں سمجھیں گے۔ ہم لاہور جا کر عالم نوبار صاحب سے خود ریکارڈ دلے میں گئے •

ہم ایک اور بانڈر میں آ گئے۔ ہونٹوں سے بنگال گانوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کوئی لڑکی بالوں میں پھولی بھاتے قریب سے گزرتی تو بڑی گہری گہری پڑ اسرار خوشبو آتی۔ اور مجھے تاریک کے اوراق میں گم پرانے پھولوں کا خیال آتا جہاں کالی آنکھوں والی دیو داسیاں گئے ہیں سرخ پھولوں کے بار بھاتے سیاہ مندریں میں چاندنی راتوں میں رقص کیا کرتی تھیں۔ ہم نے ایک ریتوران میں بیٹھ کر سبٹ کی چائے پی۔ بڑی ہی بددلتہ چائے تھی۔ ہمیں لاہور کے قی اس کی چائے بہت یاد آئی۔ ریتوران سے نکل کر ہم نے ایک دکان پر جا کر پان کھائے۔ ایک لاہوری کا پان لگا رہا تھا۔ اس کا نام محمود عالم تھا۔ میں نے اُسے کہا۔

• بھائی محمود عالم! تمہارا شہر بڑا خوبصورت ہے •

محمود عالم مسکرایا۔ مات ہم نے سبٹ میں ہی بسر کی۔ دوسرے دن واپس ڈھاکہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ ٹرین چل جا رہی تھی۔ جمیم الدین نے اپنی بنگالی نظموں کے انگریزی تراجم سامنے شرڈ کر دیئے۔ ابن انشاء تھپٹ دو آہے کی پنجابی میں جمیم الدین کی نظموں پر سائنس تھپتھپتہ کر رہا تھا۔ ابراہیم ملیس قہقہے پر قہقہہ لگا رہا تھا اور ساتھ ساتھ دکنی زبان میں جمیم الدین کی نظموں کی تعریف بھی کر رہا تھا۔ جمیم الدین کی نظموں ختم ہو گئیں تو اس نے ایک ہیرا گن کا قہقہہ سنایا۔ اس قہقہے نے ہم سب کو سحر کر دیا۔ یہ جمیم الدین کی جوانی کی آواز گرویل کا قہقہہ تھا۔ وہ اپنے بے ساختہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

• بھول ہاڑی سے آگے ایک گاؤں ہے۔ چھوٹا سا شیش ہے میں

اپنی آواز گرویل کے سلسلہ میں وہاں گیا ہوا تھا۔ پارہی پور کی جانب

سے ایک گاڑی آ کر وہاں ٹکی۔ ایک ڈبے میں سے کچھ ہیرا گن لوگ نکلے پراگ

ہاتھ ڈرا سا اٹھا کر گانا شروع کر دیا۔ اس کی آواز بڑی پڑ سن اور دلگداز
 تھی۔ یوں موسیٰ ہر ہاتھ جیسے کوئی نیمہ دہن بال بھر اپنے بچے کی
 سادھی کو جا رہی ہے۔ کچھ دیر وہ اکیل گاتی رہی پھر دوسرے میراگ بھی
 اُس کے ساتھ گانے لگے۔ اب ایسا ہوتا کہ اگلے میں ایک مصرعہ میراگ
 گاتی اور دوسرے میراگ دہراتے۔ پھر میراگ آہستہ سے اٹھی اور اُس
 نے خواب آلود انداز میں رقص کرنا شروع کر دیا۔ اس کا جم گیت کے

مدناک پچے میں نرت کر رہا تھا۔ گیت کی لے کے ساتھ ساتھ رقص کی
 گردشیں بھی تیز تر ہوتی چلی گئیں۔ ایک بول میراگ کہتے اور دوسرا بول
 میراگ کہتی۔ اس کے بلے سیاہ بال ہوا میں گردش کر رہے تھے۔ اُس کی
 پیشانی اور بازوؤں پر پینے کے موتی جھلکنا لگے تھے۔ کبھی وہ عجیب اس
 انداز میں اپنے کسی ان دیکھے دستم کو دیکھ کر مسکراتی اور کبھی ایک دم سے
 یوں ٹپکنی ہو جاتی جیسے اس کبھی اپنے مہرب سے ملاقات نہ ہوگی۔ رقص لہنے
 میں اور غرق رقص میں ڈھل گیا تھا۔ اس کی آواز ایک دوسرے فریاد میں
 تھی۔ میراگ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اب جرم میں نے دیکھا تو غفل میں
 رہنے تقریباً ہر آدمی کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے اور کپکپانے ہر زون
 کے ساتھ درد کا تھا۔ گیت جبرائیل گارہی تھی یہ تھا۔ جسے بناؤں کب
 تک انگڑے کھاتی رہوں؟ بسے موت کا سانپ ایک بار ڈس جاتا ہے
 پھر وہ کبھی اچھا نہیں ہوتا۔ دریاؤں کے دیوتاؤں سے کہو میرا محبوب مجھے
 واپس کر دے۔ وہ میرے لیے چھلیاں پکڑنے لگا تھا۔ دو پھر واپس نہیں آتا۔
 میری آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔ میں بھی رونے لگا۔ وہ رات مجھے
 خواب کے اندر گزری ہوئی کوئی رات معلوم ہوتی ہے۔ میراگ رات کے
 پچھلے پیر کے وعدہ گولی میں لوگوں کو سزا دے چھوڑ کر اپنی ٹولی کے ساتھ
 چلی گئی۔ اس کے بعد میں نے اُسے پھر بھی نہیں دیکھا۔ ہاں اس کے

ہمارے ہاں خاندان ہوش گویوں کو کہتے ہیں۔ جو ٹولیاں بنا کر دیہات
 میں گھومتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ بیاہشادوں یا دوسرے خوشی کے
 موقع پر اپنے آپ ہی لوگوں کے گھروں میں پہنچ کر اپنی محفل جما
 دیتے ہیں اور پھر کچھ بھی مل جائے لے کر آگے چل دیتے ہیں۔
 ٹرین سے جو بڑے لوگوں کی مثالی آنری اُس میں ایک میراگ بھی
 تھی۔ گیسو سے رنگ کی ساڑھی۔ ہاتھ میں اک تارا۔ پاؤں سے نینگی۔
 بلے سیاہ کھلے بال شان پر کھڑے ہوئے۔ ہاتھ پر تلک اور گلے
 میں سرف سگول کی مالا۔ اُس کے حن نے سیش پر آگ سی لگا دی۔
 ہر کوئی بت بنا اُس کی طرف دیکھ رہا تھا کسی کو پک چھپنے کی فرصت
 نہیں تھی۔ میراگ بہت حسین تھی۔ اُس کے چہرے میں ایک جادو تھا۔
 ایک زبردست کشش تھی۔ میں بھی بت بنا اس کو دیکھنے جا رہا تھا۔ جیسے
 دہری ایک شعلہ تھی جس نے ٹرین سے نکلنے ہی پلٹ فارم کو چکا
 چو نہ کر دیا۔ میراگ بڑی شان پرے نیازی سے اپنی ٹولی کے ساتھ سیش
 سے باہر نکلے اور دیکھتے دیکھتے پگ ڈنڈی کا موڑ گھوم کر کیلے کے بھندوں
 میں گم ہو گئی۔ میں نے سیش مارشے پر چھا۔ یہ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟
 اُس نے بتایا ساتھ والے گاؤں کے نکلیا کے لوگ کی سالگرہ ہے۔
 وہاں ان کا رات بھر گانا بجانا ہوگا۔ میں بھی رات کو وہاں جا پہنچا۔
 پہل کے درخت سے دریاں بھی نکلیں۔ گیس کے ہندسے روشن تھے۔
 گاؤں کے لوگ دروں پر دائرہ بنا کر بیٹھے تھے۔ میراگ ان میں پان
 چھالیہ تقسیم کر رہی تھی۔ لوگ اُس کے حن سے سو رہے تھے۔ میراگ کے
 ساتھی ساڑھ کر رہے تھے۔ میراگ وری پینٹ میں آکر بیٹھ گئی۔ برائیوں
 نے آلتارے چھوڑ دیئے تھے۔ اٹھلی اور ہاسری کی مل جلی آوازوں نے
 وہاں ایک سماں باندھ دیا۔ میراگ نے آنکھیں بند کر لیں اور پھر ایک

بالوں میں لگا ہوا سترج کل مہسرا کچھول آتا بھی یاد ہے جو سیاہ بالوں
میں سترج انگارے کی طرح دبک رہا تھا۔

حسین الدین ایک جاوگر داستان گو کی طرح بیراگن کی کہانی سنارہا تھا۔ یہ
ساری کہانی اُس نے اپنی ٹھوس انگریزی میں سنائی تھی۔ ذراک میں کہیں کہیں وہ
اردو بھی بولنے لگتا تھا۔ کہانی نے مجھے بہت متاثر کیا۔ میں خود بیراگن کے محرمین غار
ہو گیا۔ میں نے قری حسین الدین سے پوچھا کہ کیا واقعی پھر اس بیراگن سے کبھی ملاقات
نہیں ہوئی؟

اُس نے کہا۔

• اس واقعے کو بیس برس گزر چکے ہیں۔ میں نے اُس بیراگن کو پھر کبھی
نہیں دیکھا۔ خدا جانے وہ زندہ ہے کہ مر گئی ہے لیکن وہ سر نہیں نکلتی۔
اُس کے حُسن میں اتنا دبدبہ اور صیبت تھی کہ موت بھی اس سے ہار گئی
ہوگی۔

ابراہیم جلیس اس کہانی سے اس قدر متاثر ہوا کہ اُسے نیند آگئی اور وہ برقع
پر دراز ہو کر سو گیا۔ ابن الہام میرے ساتھ بیٹھا کہانی کو بڑے خوش
مناظرہ اور جب حسین الدین بھی اپنی کہانی کے اثر سے مسحور ہو کر اٹھنے لگا تو اٹھا بولا۔
• یار بنگال میں واقعی جاوہرے یہاں کی عورتیں مردوں پر جاوہر کرتی
ہیں۔ حسین الدین بڑا حقیقت پسند شاعر ہے لیکن بیراگن اسے بھی دیوانہ
بنائے تھی؟

میں نے کہا۔

• حسین الدین کی جگہ میں ہوتا تو بیراگن کے ساتھ ہی اک تارالے کے
نکل جاتا اور پھر کبھی شہر والوں کو اپنا منہ دکھاتا؟

انشاد نے کہا۔

• یہ کام تو تمہیں اس وقت بھی کرنا چاہیے۔ یعنی اک تارالے کو کڑی سلیشن

ہمارا جانا اور پھر کبھی جیس اپنا منہ دکھاؤ۔ مگر سوال یہ ہے کہ کم ہمت ایک
کام کہاں سے آئے گا؟ اچھا اٹھا کہ ریڈ پرسیشن چل کر کسی سے بات کرتے
ہیں۔

ایک جگہ ہم نے ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ کھیتوں میں پٹ من کے چھتر دیکھے
جنہوں نے کھیتوں کے کٹے ڈھانچے رکھے تھے۔ ہم نے حسین الدین کو بنگالہ کر پوچھا۔

• جہاں حسین الدین یہ کیا ہے؟

حسین الدین جیب سے چیک نکال کر بولا۔

کہاں کیا ہے؟

• وہ سامنے کھیتوں پر کھڑے ہیں کسی پڑی ہیں؟

• اوہ وہ آؤ۔ جہاں وہ پان کی بیوں کو ڈھانچا گیا ہے۔ جگہ پان۔ سیانی

پان۔ ہی ہی ہی۔ ادھر کا پان بڑا گرم ہوتا ہے؟

گلاڑی ایک بڑے خوبصورت شہر کے سٹیٹ پر رگ گئی۔ میں اس شہر کا نام بھول
گیا ہوں۔ وہاں کی رائٹر گلڈ نے میں دولت منے رکھی تھی۔ اس شہر میں پھیلے اور
بلند بہت تھے۔ ساما شہر دشمنوں میں گھرا ہوا تھا۔ وہاں کی رائٹر گلڈ کا دفتر ایک اونچی جگہ
پر تھا۔ شریں میں بید کی آرام کرسیاں ڈال دی گئی تھیں۔ میزوں پر سیب۔ کیلا۔ انار
اور دیگر کھانے پینے کی اشیاء بیٹھے سے رکھی تھیں۔ ایک نور جان مجھ سے آؤ گرافات
لینے لگا تو میں نے اس کی آؤ گرافات بلک پر رکھی۔

• یہ جگہ اتنی خوبصورت ہے کہ مجھے خیال آتا ہے کہ میں اپنی بڑی کر

ساتھ لے آؤ۔

اب وہ نور جان آؤ گرافات کے کر شہاب صاحب کی طرف بڑھا۔ انہوں نے میرا
آؤ گراف پڑھا اور سکراتے۔ پھر نکلا۔

• یہ جگہ اتنی خوبصورت ہے کہ مجھے خیال آتا ہے کہ میں اپنی بیوی لگوں

ساتھ لے آؤ۔

ابن انشاء نے آؤ گراف بک پر اپنا ایک شعر لکھا۔ ابراہیم عیس نے کوئی مزاحیہ بات لکھی جس پر تمام لوگ ہنسنے لگے۔ ایک شیخ پر کاٹھی رک کر قوم نے اناس خرید کر کھاتے۔ ابراہیم عیس کہنے لگا۔

یار ہمارے دکن میں یہ اناس اتنے نام تھے کہ کھاتے عیس کھایا کوئی تھیں؟

ابن انشاء بولا۔

بھواس نہ کرو۔ میں تمہارے دکن کی پھوڑی تاریخ سے واقف ہوں وہاں تو اناس جوتا ہی نہیں؟

عیس تبہد لگا کر بولا۔

اچھا؟ کہنے میں معلوم ہی نہیں۔ میں پہلے بتا دینا تھا۔ مگر یار اتنا یاد ہے کہ اناس قسم کی ایک چیز ہم مزدور کھاتا کرتے تھے۔

انشاء نے کہا۔

تم کچھ بگڑا کھاتے رہے ہو۔ بہر حال وہ اناس نہیں تھا۔

ایک شہر سے ٹرین گزری تو میں نے دیکھا کہ ریلوے لائن کے پار کوئی سو گز کے فاصلے پر ایک مکان پر بھارت کا ترنگہ لہرا رہا ہے۔ میں بڑا حیران ہوا کہ یہاں بھارت کا جھنڈا کہاں آگیا؟ میں نے جیم الدین سے پوچھا۔

بھائی یہ کوئی بھارت کا سفارتی دفتر ہے؟

جیم الدین مسکرایا۔

اوسے بابا! یہ بھارت ہے۔ انڈیا ہے۔ یہ سارا علاقہ انڈیا کا یا ڈومبار ہے؟

پاکستانی ریلوے لائن اور بھارت کے علاقے کے درمیان صرف ایک تار کا جھگڑا ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔ اس جھگڑے کو ان دنوں بڑے آرام سے چلا گیا تھا۔ ابن انشاء اور عیس نے بھی اس علاقے کو بڑے توجہ سے دیکھا۔

یہاں تو سب کچھ بڑے آرام سے ہو سکتا ہے۔

بھائی! جو رہی ہے۔ دن رات جو رہی ہے۔ ہم کچھ نہیں کر سکتے جیم الدین نے کہا۔

پھر قریب جیم الدین انگریزی میں اپنی بھالی نظم کا ترجمہ سنانے لگا۔ پاک جہوریت ٹرین برق رفتاری سے ڈھاکہ کی طرف اڑی رہی جا رہی تھی۔ اب اُسے کسی چھوٹے شیخ پر نہیں روکنا تھا۔ دھاکہ اور پٹنہ کے کھیت پیچھے جا رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے شہر اور قصبے گزر رہے تھے کہیں دل میں یہ گمان بھی نہ گزرا تھا۔ کہ ان علاقوں سے ہمارا نام لڑا جائے گا۔ یہ ماہی گیروں کے شیشے گیت کچھ کبھی سننے کو نہیں گئے۔ یہ صلیج بنگال کی ہواؤں میں جھومتے نابل اور ٹاٹکے درخت پھر کبھی دکھائی نہ دیں گے۔ ایک بہت بڑا دریا آیا۔ اس کا پل بہت اونچا تھا۔ اور انجینئرنگ کا اعلیٰ ترین نمونہ تھا۔ دریا کا چوڑا پل ڈھابوں میں چمک رہا تھا۔ کئی ایک کشتیاں چل رہی تھیں۔ ایک شہر سامان اور سفر لاسے سیٹی بجاتا چلا جا رہا تھا۔ آج اس دریا کو یاد کرتا ہوں۔ تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے خواب میں ایک دریا دیکھا تھا۔ خواب میں ایک خواب دیکھا تھا۔ ٹرین ڈھاکہ پہنچ گئی۔ کچھ پرسشیں پر پڑا رہا تھا۔ مسافر سامان انشاء نے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے بڑا ہی کوئی گاڑی چھوٹنے والی تھی۔ انشاء نے پلٹ خاتمہ پر گھڑنے ہو کر ایک چھوٹی سی انگریزی ٹی اوٹھنک کے شیشے صاف کرتے ہوئے بولا۔

لوسیاں! مشرق پاکستان کی سیاحت بھی کر لی۔ ویسے یار دماغاتی کی

گھر سڑی جا رہی ہے؟

ابراہیم عیس ہانوں میں کھنکھی کرتا قریب آیا۔

سنو بٹ سڑی پاکستان سے آدمیوں کا بہت بڑا ٹرڈھاکہ پہنچ چکا ہے۔

منا تو ہم نے بھی ہے۔ چلو بھائی گاڑی میں بیٹھو۔ جو سٹل چل کر تازہ دم

ہوتے ہیں؟

جو سٹل پہنچے تو وہاں بڑی رونگ لگ رہی تھی۔ کراچی اپنی پٹری، پٹنہ اور لاہور سے لکھے ہیں ادیب اور شاعر آتے ہوئے تھے۔ لائن میں آرام کر سبوں پر شاہد احمد دہلوی۔

خواجہ ابوبکر اقبال، قرۃ العین حیدر اور امیر حمزہ شہزادہ کی بیٹے باتیں کر رہے تھے ناصر کاغلی
سکھتا ہوا چاروں طرف بڑھا۔ باری باری سب سے گلے ملا۔

”ابے جید! ایک مدت کے بعد نایل کا درخت دیکھا۔ سنا ہے آج کل

یہاں کھیتیں بھی ہوتی ہیں؟

امیر حمزہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

”کو کو کھانا کو کو؟“

ناصر کاغلی نے قہقہہ کیا۔ ”کو کو؟“

ابن النساء نے کہا۔

”ہاں یہاں! یہاں تو آتا ہے اسے پستے روز کو تو ضرور دیکھا نا پڑتا ہے۔

آؤ ہمارے ساتھ۔“

ہم ناصر کاغلی کو اپنے کمرے میں لے گئے اور کوئٹے کی بیٹ منگوا کر اس کے
آگے رکھ دی۔

”لو کھاؤ کو تو۔“

ناصر کاغلی بڑا ہنسنا اور بڑے شوق سے کوئٹہ کو کھانے لگا۔ سگریٹ اب
بھی اس کی انگلیوں میں چل رہا تھا۔ یہ دھواں صرف ناصر کاغلی میں ہی دیکھا کر سارا
سگریٹ اس کی انگلیوں میں چل جاتا تھا تو کیا جمال کو کسی انگلی کو آگے آہتا ہے۔ دوسرے
اجاب بھی باری باری ملے۔ یہ اصحاب مشرق پاکستان رانہ کوڑی دھواں پر آتے تھے۔ اگلے
دو ذریعہ سب لوگ سمندر بن کی سیر کر رہے تھے۔ قوی جم الدین نے تمام اصحاب کو رات کے
کھانے کی دعوت دے رکھی تھی۔

قوی جم الدین کا گھر ڈھاکہ شہر سے باہر ایک تالاب کے کنارے پر تھا۔ اس
تالاب کے کنارے ایک پرانی کشتی آدمی پھنس جوتی نہ جانے کب سے وہاں پڑی تھی۔
سکان کے دھواں سے پریش جیروں کے پاس ایک سفید فراک والی بڑی معصوم بچی رونق
جو بھولوں کے باروں کی چکر رکھے کھڑی تھی۔ ہر مہمان کو ایک ایک ار سے وہی تھی۔

مہمان اسے کرشمہ ادا کرتا اور چٹی کے سر پر ہاتھ رکھ کر پیا کرتا۔ دوسرے یہاں چڑھ
کر ایک برآمدہ تھا۔ پھر ایک کھڑا کمرہ تھا جہاں زمین پر دریاں بھی تھیں۔ مگر سب سے
کرسیاں اور صوفے لگے تھے۔ مہمان یہاں بیٹھتے چلے گئے۔ چھت میں بڑی تیز روشن والا
بلب روشن تھا۔ قوی جم الدین نے بڑا پڑنگھٹ کھانا پکوا یا تھا۔ بریانی، قورمہ
بھی تھا اور دال بھات بھی جس کا جو جی چاہے کھائے۔ سو بیٹ ڈش کے لیے
کوری مٹی کے کاغذی پیالوں میں کھیر آئی۔ جس پر زعفران سے بنگالی کچھ لکھا تھا۔
جلس نے انشاء سے پوچھا۔

”یہ کھیر پر کیا لکھا ہے؟“

ابن النساء نے کہا۔

”لکھا ہے۔ تیرو جی کھیر۔“

پڑنگھٹ کھانے کے بعد چائے اور کافی کا دور چلا۔ لوگ ٹوٹیوں میں بیٹ
لگے اور دنیا جہاں کے موضوعات پر باتیں شروع ہو گئیں۔ اسٹے میں ہال کمرے
کے بیچ میں آکر کھانے بھانے والے بیٹھ گئے۔ ایک دہلی پتی ساڑھی سی لڑکی نے آ
کر سب کو ادب سے سلام کیا۔ سیاہ آنکھیں، نیچے نقش اور لمبے سیاہ بال۔ یہ
اُس زمانے کی جھڑا اور آج کی مشہور فلم ایکوئیس شبنم تھی۔ قوی جم الدین نے اس
کا تعارف کروایا کہ جھڑا دوسری جماعت میں پڑھتی ہے اور قص کرے میں اپنا
بھابہ نہیں رکھتی۔ جھڑا کے ساتھ ایک اور لڑکی بھی تھی ماس کا رنگ ذرا کھلا تھا
اور قد چھوٹا تھا۔ دونوں نے سفید ساڑھیاں پہن رکھی تھیں۔ ہاتھ پر تلک لگے تھے۔
سازجگنے کے مردوں نے گانا شروع کر دیا اور دونوں بنگالی لڑکیاں رقص کرنے لگیں۔

پستے انہوں نے بنگال کے ایک ماہی گیر کی زندگی کا نقشہ بیان کیا۔ ساتھ ساتھ وہ
گیت بھی گانے لگیں۔ وہ رقص کی دھیمی گردنوں اور نریت سے گیت کا جنم بھی
ادا کر رہی تھیں۔ کہیں وہ ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر بارش کی دعا کرتیں۔ کبھی
باندوؤں اور انگلیوں کی تیز حرکت سے برقی بارش کا سماں پیش کرتیں۔ کبھی زمین

پر جھک کر دھان کی خیری بولیں۔ کبھی دریا پر کشتی کی تینیں ابھی لہاں تے کھیتوں کو دیکھ کر خوشی سے جھوم جھوم اٹھتیں۔ پھر لکھنؤ سے ہم کو ایک طرف کھڑی ہو جائیں جیسے ساہوکار فصل میں سے اپنا حصہ لینے آگئے ہوں۔ کبھی وہ ایک بچے کو گڑی میں نہاں کر کے اور کبھی دوسرے بچے کو چپ کر تیں۔ پھر وہ سر جھکا کر اکھڑے اکھڑے قدموں کے ساتھ رقص کرنے لگیں اور بار بار آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا تیں۔ جیسے آسمان سے انصاف کی طلب گار ہوں۔ اب ان کے ساتھ دوسروں بھی رقص کرنے لگے تھے۔

ان لوگوں نے کئی ایک رقص اور گیت پیش کئے۔ جیسے سب لوگوں نے بے حد پسند کیا۔ مہانوں نے رخصت ہوتے وقت قری جیم الدین کی جہان نازی کا بے حد کپور ادا کیا۔ قری جیم الدین بار بار جھک کر کہہ رہا تھا۔

”مجھے خوشی ہوئی ہے۔ بہت خوشی ہوئی ہے۔“

رات کو گھنٹن سینما کے ہال میں شامہ بھی تھا۔ جیم الدین کے گھر سے شامہ حضرات سیدھے گھنٹن سینما کی طرف چل دیئے۔ ابن انشا کو دعوت دی گئی تھی مگر اُس نے کلام نہ سننے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ میں نے جلیس نے اُسے بہت مجبور کیا تو وہ راضی ہو گیا۔

”گھبراؤ نہیں، ہم تمہارے ہر شعر پر داد دیں گے۔“

ان لوگوں سے کچھ کچھ بھرا ہوا تھا۔ شامہ شروع ہو گیا۔ ابن انشا کو حال اور شہاب صاحب نے بھی قائل کر لیا تھا کہ اُسے اپنا کلام ضرور سنانا چاہیے۔ میں نے اُسے کہا۔

”پھر کیا ہوا جو لوگ تمہارے کلام پر ہونٹ کھرتے ہیں۔ کچھ اخلاقی آئندہ نے بھی جوستے ہیں۔“

ابن انشا کو نام پکارا گیا تو وہ بڑے سکون سے اٹھ کر بیٹھ گیا یا کچھ دیر کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ ایک دو دو لپٹ فٹے چٹتے کئے اور ایک غزل تحت القفل پڑھ کر سنائی۔ خطاب مول وہاں اُسے لوگوں نے کچھ کچھ کی داد دی۔ میں بڑی

چیرائی ہوئی۔ جب وہ واپس ہمارے پاس آیا۔ تو میں نے کہا۔

”یہ غزل تمہیں کس نے لکھ کر دی تھی؟“

ابن انشا مجھے گالیاں دینے لگا۔ میں شاید سگریٹ لینے ہال سے باہر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ نامر کاظمی لنگتے سگریٹ والا ہاتھ جڑوں کے پاس رکھے ہوئے تھا۔ میں ایک طرف چلا جا رہا ہے۔

”ارے میاں! تم کو کھر جا رہے ہو؟“

نامر کاظمی نے کہا۔

”بیٹے پر شاہد میرا نام پکارا گیا ہے۔ اس لیے بھاگ رہا ہوں۔“

”بھائی خدا کے لیے ایسا دکرنا۔ چلو واپس چلو۔“

اور میں اُسے کھینچ کھانچ کر شیخ پرے گیا اور سکر پڑی کے حوالے کر دیا۔

پتیاں یہاں تک تو میں اس شخص کو لے آیا ہوں۔ اب تم جانو تمہارا کام؟

نامر کاظمی واقعی اپنی ترنگ کا شاعر تھا۔ ہمیشہ مشاعرے میں دیر سے آتا اور کبھی کبھی اپنی باری آنے سے پہلے ہی مشاعرہ چھوڑ کر چلا جاتا۔ گھنٹن سینما والا شامہ بڑا کامیاب رہا۔ یعنی وہاں ابن انشا کو بھی داد مل۔ اس سے زیادہ اس شاعرے کی کامیابی اور کیا ہو سکتی ہے؟ میں نے اور جلیس نے انشا کو خوب تنگ کیا شامہ رات گئے ختم ہوا۔ ہم تنگ گئے تھے۔ جوٹل میں آتے ہی اپنے بستروں پر پڑ گئے۔ ابن انشا صبرِ مروت نیم گرم پانی کے عمارے کرنے لگا۔ میں نے اُس کی غزل پڑھنا سے تنگ آ کر کہا۔

”یہ تم نے کیا پکارا کھر شروع کر رکھا ہے!“

وہ بولا۔

”سارے تم نے آج مجھے بڑے پان کھلائے ہیں۔ گلا درد کرنے لگا ہے۔“

ابن انشا کو کبھی کبھی کلمے کی شکایت ہو جا یا کرتی تھی۔ لا جو میں میں نے

اُسے اکثر نیم گرم پانی کے عمارے کرتے یا گئے میں گلیسریں لگاتے دیکھا تھا۔ اُسے

زیادہ اہمیت اس لیے زوی کر گئے کی شکایت تو مجھے بھی ہو جا یا کرتی تھی۔ ویسے مجھے یاد ہے ایک بار میں نے اُس سے پوچھا تھا۔

”تو میں نے تو نہیں بڑے گئے۔ میرا مطلب ہے ناساز تو نہیں ہیں؟“

اُس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

”ایسی کوئی بات نہیں پیارے۔“

ابراہیم بیس بڑے زوروں کے خراٹے لے رہا تھا۔ انشاء نے گرم پانی کا خالی گلاس میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

”سالایا تو یہ خواب میں کسی کو ڈرا رہا ہے یا خود ڈر رہا ہے۔“

”اس کے خراٹے بند کراؤ۔“

بہنہ ابراہیم جیسے کواڑوں سے پکڑ کر پٹنگ پر بٹھا دیا۔ وہ ہڑ بڑا کر بولا۔

”یہ ابھی شور کیسا جو رہا تھا؟“

”کیئے تو خراٹے لے رہا تھا۔“

جیسے کروٹ بدل کر پھر سو گیا اور تھوڑی دیر بعد پھر خراٹے لینے لگا۔ ایسے اُس وقت ہم سوچنے لگے اور شاید ہم بھی خراٹے لے رہے تھے۔ صبح ناشتے کے فارغ ہو کر مجلس گڈ کے دفتر کسی کام سے چلا گیا۔ میں نے اشد سے کہا۔

”یار ربیعا نہ کہے لیے ایک ساڑھی خریدی ہے۔ میرا خیال ہے قرۃ العین

جید کو ساتھ لے کر ٹیڈ مارکیٹ چلتی ہیں۔ وہ کوئی دلکش سا رنگ ہیں

تلاش کرو لے گی۔ یہ کیکر ساڑھیوں کے ساتھ میں ہم دونوں صحت ہیں۔

انشاہ نے لگا۔

”میں تو یہیں شہدای کے کمرے میں ہوں۔ ساڑھی خریدنی ہے تو میں کوئی

ساتھ لے جانا پسند ہے گا۔ اس کا ذوق بہت اچھا ہے۔“

ہم نے قرۃ العین جید کو ساتھ لیا اور ٹیڈ مارکیٹ آگئے۔ یہاں کالوں میں ساڑھیں

کے انہار لگے تھے۔ کالدار قینے سے قیمتی ساڑھی دکھا رہے تھے اور ہم سستی سے

سستی ساڑھی کی تلاش میں تھے۔ آخر عین صاحبہ نے یہیں ایک ساڑھی لے دی۔ اس ساڑھی میں مداس کے رنگ غالب تھے جو مجھے بھی بہت پسند ہیں۔

یعنی گیر و اسبیاء اور سرخ۔ کچھ نوادرات انشاء نے خریدے۔ پھر ہم ایک لڑکوں

میں بیٹھ کر کھانا کھینے لگے۔ کالوں کے اوپر زور کیوں کے گئے ایک ایک تھے

اور بانس کی ایک خوبصورت ڈگری میں دو چار انسان بھی پڑے تھے۔ میں نے

قرۃ العین سے کہا۔

”یہ بری کیلا ہے۔ بڑا ایشیا جوتا ہے۔“

ابن انشاء نے کہا۔

”یہیں کھلاؤ گے تو جانیں گے؟“

میں نے کچھ کیلے اور انسان لائے کو کہا۔ بنگالی لاکر نے ڈگری میں سے

ایک انسان شاخوں سے پکڑ کر اٹھایا۔ اُسے بڑی سی پلیٹ میں رکھا اور تیز

چھڑے سے بڑی مہارت کے ساتھ اس کی چھال اتار ڈالی اور پھر تھکے بنا کر پلیٹ

میں بجا ہمارے آگے لا کر رکھا۔ قرۃ العین نے کہا۔

”اس کی خوشبو بڑی گہری ہے؟“

”ہر ماں انسان گہرے گولڈن کھر کے ہوتے ہیں۔“

ابن انشاء نے لگا۔

نامہ کاغذی کرتا ہے کہ ناشتے پر صبح بچے انسان سٹے تو میں گھر سے

باہر نہیں نکلتا۔“

قرۃ العین نے مسکرا کر کہا۔

”کیا واقعی؟“

میں نے کہا۔

”نامہ کاغذی کرشن ٹکڑی دہتا ہے۔ وہاں اسے بہاراج کرشن تو مل

سکتے ہیں مگر انسان کبھی نہیں مل سکتا۔“

”ویسے بات اس نے خوبصورت کہی ہے :

”ناصر کاغذ کے شروں میں اتناں کی خوشبو ہوتی ہے ؟

”رات شاعرے والی اسکی غزل بہت پیراری تھی ۔ بارشوں ، دریاؤں

پھولوں کا شاعر ۔ خدا اُسے لمبی عمر دے ۔“

قرۃ العین حیدر کی دماغی ناصر کاغذ کو ملک عدم کے سفر سے نزدیک
سکی اور ہمارے دیکھنے دیکھتے بارشوں ، دریاؤں ، پھولوں اور کونوں کی صداؤں
کے ساتھ ساتھ اُن دیکھے جڑبڑوں کو سفر کر گیا ۔

عجیب مانوس اہلی تھا

مجھے تو حیران کر گیا وہ

ٹوہکا کہ میں زمنا کے میدان میں ناکش گئی تھی ۔ شام کو ہمارے ادیب شاعر
دوست تو ریل میں بیٹھ کر چٹا گانگ کی طرف روانہ ہو گئے اور میں ، ابن انشا اور
جلیس ناکش دیکھنے چل دیے ۔ ہر مثال بہترین انداز میں بجا گیا تھا ۔ کہیں ایک
بڑی کشتی ، مٹی تھی ۔ کہیں جھونپڑی برقی ققوں سے جگمگا رہی تھی ۔ بجالی عورتیں ،
مرد اور بچے سیر کر رہے تھے ۔ شہنشاہی غنک ہوا چل رہی تھی ۔ مارچنی رستورانوں
میں دیکار ڈانگ ہو رہی تھی ۔ بجالی گلاؤں کی تائیں اُڑ رہی تھیں ۔ ہاؤں کے ٹوڑے
ہلک اڑا رہے تھے ۔ پیشانیوں کے ٹک دھک رہے تھے ۔ آوازیں ، چہرے اور
آنکھیں ہنگام کے حیریں ڈوبی ہوئی تھیں ۔ ریشمی سا دھمی سر راتی ہوئی قریب
سے گزر جاتی تو کبھی ناریل کی ہلک آتی ، کبھی اتناں کی خوشبو آتی اور کبھی
یوں محسوس ہوتا جیسے کسی گئے جنگل کے پرانے مندر میں کوئی دیو داسی اپنے دیوتا
کے چہروں میں عود و عنبر شکار رہی ہے ۔ یہ سب کچھ ایک خواب گسدا تھا ۔
اور آج صبح ایک خواب ہو کر رہ گیا ہے ۔ کہاں پہلے گئے وہ لوگ جو مندر میں
کشتیوں کے بادبان اڑا دیاؤں ، سمندروں کے سینے پر کھولتے تھے ؟ جو دریا کے
ایک کنارے پر کھانا پکاتے اور دوسرے کنارے پر جا کر کھاتے تھے ؟ جو

سائپوں کے ہلوں میں ہاتھ ڈال کر قیمتی پتھر نکالتے تھے ۔ جن کی بھٹیالی کی دگدگ
”تائیں میٹھکتا ، پدما اور کرناٹکی کی لہروں کے ساتھ ساتھ سفر کرتی تھیں اور جہاں
بلے ہالوں والی سیاہ چشم دیو داسیاں ٹھوڑے میں رہتی گندھا کے سفید پھول سما
کر گھر سے نکلتی تھیں ۔ آہ ! وہ ناریل کے سبز جھنڈوں میں سرگوشیاں کرتی جنوب
شرقی ایشیا کے سمندروں کی مرطوب ہوا میں ۔ سلٹ کے چاتے کے پامات کی
ہری بھری ڈھلانیں اور سمندر میں کے جنگل میں سنبل کے سرخ پھولوں جیسے
درخت ۔ اور وہ گیت گاتی ، روتی ، ہر اکن کا حسین چہرہ جس کے حسن بے
مثال نے ہر ایک پر جادو کر دیا تھا !

زخمی برقی کی پکار آج بھی سمندر میں کی وادیوں میں گونج رہی ہے ۔

نہ دیکھی لام تار چندر ٹوکھ

نہ کہن لام سینہ نہ ریر کھلتے

کی شیل ماری لی بھاتی تیر انداز سے

(نہجی بھر کر دیکھ پانی اسکا چاند سا مکھوا

نہجی بھر کر اُس سے پیار کی باتیں کر پانی

کیسے تیکھے تیر سے گھال کر دیا تو نے ۔

او بھاتی تیر انداز !)

سوچتا ہوں اب تو کبھی ابن انشا اور ابراہیم جلیس کے ساتھ سمندر میں نہ جا سکوں
گا ۔ کبھی ان کے ساتھ رائگا متی کے ریسٹ ہاؤس میں بیٹھ کر چاتے دینی سکوں
گا ۔ اور پیکر قبیلے کی عورتوں کو قفس کے دائروں میں گم ہوتے نہ دیکھ سکوں گا ۔
میز پر سے لاپرواہی گھر گھر آئیں گے ۔ رائگا متی ریسٹ ہاؤس کی چھت سے
شاہپ پانی کی بوندیں گریں گی ۔ میز کی پھواری غل مہر کے سڑنے پھولوں کا
مذہبلاں گی اور دودھ نیچے کرناٹکی کے سبز پانیوں پر کھلے ہوئے کونوں کے
سفید پھول پکس گے ۔ ناریل اوتار کے ادھے ادھے درختوں کی چھوٹی شاخیں

زبیں دوسرے اشارے کریں گی۔ میں اپنے پاس بلائیں گی۔ ابن انشا کو داریں
دیں گی۔ مگر کوئی ان کے پاس نہیں جاتے گا۔
زحیٰ ہرقی کی پکار جانے کب تک ان جنگلوں میں گوجن رہے گی؟

رات کے پچھلے پہر میں ڈھاکرے پروانہ کر گیا۔
ابن انشا میرے جلنے کے ایک یا دو روز بعد ایک بڑا ڈھاکرے پیدا کر چکی
چلا گیا۔ میں لاہور آ گیا تھا۔ اس کے بعد ابن انشا سے جب وہ لاہور آتا تو ملاقات
ہوتی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ مجھ سے ملے بغیر واپس کر لی جلا جاتا۔ اگلی بار
ملا تو کہتا۔

”بہت معروف تھا اس لیے ملنے نہ آ سکا۔“

ابن انشا اب واقعی بہت معروف رہنے لگا تھا۔ آج یوگنڈا میں ہے تو
کل جاپان کی طرف اڑا جا رہا ہے آج گوئٹے ملائکہ اوپر سے گزر رہا ہے تو گل پیرس
یا کوپن ہیگن کے کسی کپڑے میں کان پی رہا ہے مجھے اس پر رشک آتا تھا۔ میں
اُسے کہا کرتا تھا کہ ابن انشا، باتم ایک اعتبار سے قابل رشک ہو کر ملک ملک کی
سہری کرتے پھرتے ہو لیکن ایک اعتبار سے بد قسمت ہو کر پیرس اور کوپن ہیگن
میں بیٹھ کر بھی چائے پیتے ہو۔

”کم جنت اور کچھ نہیں تو ٹھنڈی سہری جبر کے ہی دعوے میں پلایا کرو۔“
مگر ابن انشا ان چیزوں سے بہت آگے تھا۔ یا بہت پیچھے تھا۔ ایک بار
میں جبر خریدنے گیا تو وہ میرے ساتھ تھا۔ میں جب کبھی فریخ وائن والوں سے

بیتر خریدنے جاتا تو پہلے فیروز سنز کی دکان سے انگریزی اخبار لیڈر خریدتا۔
پھر بیٹر کو اس میں اچھی طرح پلٹ کر ایسے لے جاتا جیسے اخبار لے جا رہا ہو۔
کاؤنٹر والا یہ سمجھتا کہ میں اخبار لیڈر کا زبردست مداح ہوں جو باقاعدگی سے
وہاں آکر صرف وہی اخبار خریدتا ہوں۔ اصل معاملہ ہوتا کہ وہ اخبار بیٹے
ساتر کا تھا اور اس میں بیٹر کی بوتل بڑی آسانی سے چھپ جاتی تھی۔ ابن اثنا
کو میری اس حادثہ کا علم تھا، چنانچہ اس روز بھی وہ میرے ساتھ تھا۔ ہم
فیروز سنز کی دکان میں داخل ہوئے اور میرے اس کاؤنٹر پر گئے۔ جہاں ہمارا
مطلوبہ اخبار رکھا تھا۔ ابن اثنا نے اخبار اٹھا کر دیکھا اور کہا۔
”بھئی واہ! آج تو اس نے بڑی زبردست سرخی جھانکی ہے۔“
”اچھا! فوراً دکھانا تو۔“

اور ہم دونوں اعلیٰ سرخیوں پر یوں بحث کرنے لگے جیسے بڑے پرانے پکات
دان ہوں۔ حقیقت یہ تھی کہ ہم میں سے کسی نے بھی اس کی کوئی سرخی غور
سے نہیں پڑھی تھی۔ میں نے ایک آدمی سے کہ اخبار خرید کر بڑی احتیاط سے نقل
میں دیا اور ابن اثنا کو لے کر فریج وائن والوں کی دکان پر لے گیا۔ ابن اثنا نے بھی میرے ساتھ
اس دکان پر جاتے ہوئے براہِ موص نہیں کیا تھا، چنانچہ اس روز بھی جب کاؤنٹر پر بیٹر کی بوتل
دی تو اسے اثنا نے ہی میرے لیے بڑی احتیاط سے پکڑنے کا لہجہ سے اخبار میں پیش کیا اور
پھر مجھے پکڑا دی۔ ہاں بوتل کے پیسے مزدور میں نے ادا کئے۔ اس کے بعد جب
میں نے بیٹر دینا چھوڑ دی تو اس نے مجھے خط میں لکھا کہ سنہا ہے، آج کل لاہور
میں ”لیڈر“ اخبار کی اشاعت ہو گئی ہے؟ اور کتنے تھکے تھکے خبر پرانی فیروز سنز والا
کاؤنٹر بوائے کیا سوچتا ہوگا؟

ایک روز مجھے ریڈیو اسٹیشن پیغام ملا کہ ابن اثنا دکانوں آیا تھا، میں نے
نیشنل بک سنز فون کیا تو ابن اثنا بول رہا تھا۔
”ہاں میں نے فون کیا تھا۔ بس آجاؤ۔“

میں دو ایک مژدہ کی کام جلدی جلدی ٹھاکر نیشنل بک سنز کے دفتر پہنچ گیا۔
ابن اثنا وہاں ذوالفقار تاشا کی بی بی میز پر بیٹھا کچھ کھ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ
اُس کے بالوں میں تازہ تازہ خضاب لگا تھا اور اس کے کتے بھاری بھاری
تھے۔ حسبِ معمول ہم نے گلیوں سے ایک دوسرے کا رخ مقدم کیا۔
”عمر اے تم ریڈیو والوں کو بے وقوف بنالے ہو۔ جب فون کرو
نہیں ملتے۔ کوئی کتاب لے لے ابھی یہاں تھے۔ کوئی کہتا ہے وہاں تھے۔
یہ بتاؤ تم ہوتے کہاں ہو؟“
میں نے کہا۔

”یاریہ تشارا گلایوں سوچا جو اسے؟“
”دون ہلا کر بولا۔“

”کیسے پہلے میرے سوال کا جواب دو۔“

میں نے دیکھا کہ ابن اثنا کے سر کے بال کافی پتے ہو گئے تھے۔ ماٹھا تو
بال صاف ہو گیا تھا جو پہلے کبھی قدرتی سیاہ بالوں سے بھرا ہوا ہوتا تھا۔
نہلا ہونٹ مٹا ہو گیا تھا اور کتے بوجھل ہو کر ڈھلک رہے تھے۔ جسم
پہلے سے بھاری اور موٹا ہو گیا تھا، لیکن شکل سے گٹا تھا کہ وہ صحت
مند نہیں رہتا۔ میں نے اُس کے ہونٹوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔
”تم ہاں کے ملکوں میں جا کر زیادہ تو بھل تو نہیں بچتے؟“

پھر میں نے اُسے ایک سیلف سٹایا کر ایک امریکی نیا نیا ویٹ نام میں
ایک ملوا کف کے پاس گیا۔ اس کا سنہ اس قدر خوشگام انداز میں ہو گا کہ خواہ
دو دنوں کا ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کر پیچھو گئی۔ پھر امریکی سے پوچھنے لگی،
”تم فرج میں کیا کرتے ہو؟“

امریکی نے کہا۔

”میں فوجی جینٹ میں بھگ رہا ہوں۔“

اس پر ابن انشا بڑا ہنسنا اور مجھے بے نقط سنانے لگا کہ کیسے تم مجھ سے جھگڑے ہو۔ میں نے تو آج تنگ کسی عورت سے یہ نہیں کہا کہ میں بگل بجاتا ہوں۔

چلے آگئی۔ میں نے کہا۔

۱۰ یا ر آج توجہ جتا ہے لارنس باغ چل کر چائے پی جائے۔

وہ ینک کے موٹے ٹیشوں کے پیچھے آنکھیں گھما کر بولا۔

۱۱ ارے میں تمہاری طرح کوئی بیکار تو نہیں ہوں۔ چل چکے سے

چائے پی۔ اچھا تو تمہیں ایک بڑھیا سگریٹ بھی ملنا ہوں۔

پھر اس نے اپنے بریت کیس میں ایک گنگ سا تو کاغذ سگریٹ نکال کر مجھے دیا۔

۱۲ یاد رہے، اس کے ایک دوکش میں بھی لگاؤں گا۔

لارنس باغ کے درختوں سے وہ دھڑ ہو گیا تھا۔ اب اسے آفتاب کے زرد

پھولوں کی ٹہک بھی اپنی طرف نہیں کھینچتی تھی۔ کبھی وہ میرے ساتھ لارنس باغ

کی گردش پر چلتے ہوئے کوئی زبرد پتا باکسی چڑیا کا پر اٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لیا

گرتا تھا لیکن اب اس کی جیب بریت کیس میں آگئی تھی۔ جس میں بڑے سی تھقی

بڑے ہی بیکار کا غلات، ہر ساڑ کی چمک، بیل، چھوٹی بڑی فائیں، ٹیل

نون غبروں سے بھری ہوئی ڈائریاں اور لالہ دواؤں کی شیشیاں بھری راتیں۔

کبھی کوئی شیشی کھول کر گول پانی سے نکلتا۔ کبھی کسی شیشی کا ڈھکن کھول کر ناک

میں یا گھنے میں قطرے چکانے لگتا اور کبھی سبز سرخ نیلے پیلے رنگ کے کیپسول کو

ہتھیلی پر رکھ کر غور سے لگتا اور پھر حلق میں اتار لیتا۔ جتنی دیر میں اس کے

پاس بیٹھا چائے پیتا رہا، وہ برابر فون کرتا رہا۔ کبھی کراچی، کبھی حیدر آباد اور کبھی

اسلام آباد۔ ساتھ ساتھ مجھ سے بھی باتیں کئے جا رہا تھا۔ اسکی چائے ٹھنڈی

ہو گئی۔ میرا سگریٹ ختم ہو گیا۔ پھر اس نے گھر ملی دیکھی اور ایک دم سے امیٹ

کر بولا۔

مجھے ایک مزوری ینک میں جانا ہے شام کو ملوں گا۔ تم بے شک

نونی کے بعد گھر پر آ جانا۔

میں رات کو اس کے گھر گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ نہیں ہوگا۔ اگلے روز

میں نے فون کیا تو پتہ چلا وہ شام کی ملاقات سے کرا گیا تھا کیونکہ رات میں بچے اٹنے لڑنے سے

بیونس آئرس کے لیے ایک فلائٹ پکڑ لی تھی۔ میرے خیال میں ابن انشا کے

سفر اتنے اور جلد نہیں تھے جتنے دلچسپ اس کے سفر نامے تھے۔ وہ ابن بطوطہ

کے تعاقب میں حزرہ نکلا تھا۔ مگر اس سے ابن انشا کی ملاقات نہ ہو سکی۔ ایک بار

شیخ غلام علی پبلشرز کے دفتر میں اس سے اچانک ملاقات ہو گئی۔ ہم اندر لے گئے

ایک ریل ٹورنٹ میں آگئے۔ پائے سنگرائی۔ دیر تک باتیں کرتے رہے میں نے

خصوص کیا کہ اسکی صحت ٹھیک نہیں ہے۔ پھر اچانک گھڑی بدنگاہ ٹال کر اٹھ

کھڑا ہوا۔

۱۳ اب چلنا چاہیے۔ مجھے ایک مزوری ینک میں جانا ہے۔

اب تو انشاء سے ملاقات ایسے ہی ہوا کرتی۔ اچانک اور مختصر۔ کبھی جیسے

بعد کبھی سال بعد۔ پھر پتہ چلا کہ نوکیو علاج کے لیے گیا ہے۔ یہ بڑی خفیہ خبر تھی

جس کا لاہور میں شاید دو ایک آدمیوں کو علم تھا۔ واپسی پر لاہور کا تو میں نے

فون پر اس سے پوچھا کہ خیریت تھی؟

۱۴ یہ کس دشمن نے خبر اڑائی ہوگی۔ ارے مجھے کیا ہو گیا ہے؟ بالکل

ٹھیک ٹھاک ہوں۔

اسکی موت کے بعد معلوم ہوا کہ خبر سچی تھی۔ وہ نوکیو جیک اپ کر دے

گیا تھا اور وہیں ڈاکٹروں نے اس کے مہک مرض کی نشان دہی کر دی تھی۔ مگر

ابن انشاء نے کسی کو نہ بتایا کہ اسکی زندگی کے دن پورے ہونے کو ہیں۔

ابن انشاء سے میری آخری ملاقات میرے سن آبا دوالے مکان پر ہوئی۔

یہ ملاقات بھی اچانک تھی۔ میرے ہاں کوئی تقریب تھی۔ بہانوں کو رات کے کھانے پر بلایا ہوا تھا۔ بہانہ کھانا وغیرہ کھا چکے تھے۔ گھر میں برتن وغیرہ بیٹے جاہلے تھے۔ شروع سرودوں کا موسم تھا۔ میں صحن میں دیگ کے پاس کھڑا زردے کی کھرچن اتروا کر پلیٹ میں ڈال رہا تھا کہ باہر ایک گاڑی آگئی۔ بڑے بلب کی روشنی میں مجھے گاڑی میں سے ابن اثنا باہر نکلتا نظر آیا۔ میں پلیٹ تپائی پھر دیکھ کر اسکی طرف بڑھا۔

”تم لاہور میں تھے تو مجھے بتایا کیوں نہیں؟ مجھے کتنی خوشی ہوئی جو تم بھی دعوت میں شریک ہوتے۔“

وہ اپنے خاص انداز میں سکوتا ہوا اندر مگر ڈرائیونگ روم میں بیٹھ گیا۔ پرانے قالین پر خوبصورت بہانہ لڑکیوں کے جوڑے سے گری ہوئی گلاب کی سرخ پتیاں ابھی تک بکھری پڑی تھیں۔ کمرے کی فضا بریانی، زردے، عدا کے پھولوں اور قسم قسم کے اعلیٰ پرئیز کی خوشبوؤں سے بوجھل سی تھی۔ ابن اثنا صوفے کے کونے میں بیٹھ گیا۔ میں نے ریحانہ سے کہا۔

”کھانا لے آؤ۔“

”جتنی کھانا تو میں کھا کر آیا ہوں۔ کوئی گنجائش نہیں ہے۔“

”تو پھر زردہ کھا لو تم پسند کرو گے۔ خالص کشمیری زردہ ہے۔“

”ہاں البتہ تمہارے گھر کا زردہ حور چکھ لوں گا۔“

ریحانہ نے زردہ پلیٹ میں ڈال کر دیا۔ ابن اثنا نے ایک پیچ منہ میں ڈالا

اور بولا۔

”جتنی زردہ تو بہت کمال کا ہے مگر یہ بھی بتاؤ کہ تقریب کبھی تھی؟“

ریحانہ اس سے باقی کرنے لگی۔ میں نے مسودے ٹھنڈا پانی لانے کو کہا۔ پھر سرگٹ مسلک کر ابن اثنا کے پاس بیٹھ گیا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ میں آخری بار ابن اثنا کو دیکھ رہا ہوں۔

”تم لاہور میں تھے تو مجھے ریڈیو سیشن کم از کم فون ہی کر دیتے۔“ ابن اثنا پانی پی رہا تھا۔ مجلس رکھ کر بولا۔

”ارے میں تو آج ہی آیا ہوں۔ آج ہی جا رہا ہوں۔ رات گیارہ بجے کی فلائٹ پر۔ سوچا تم سے ملنا جاؤں۔ زردہ مزے دار ہے۔“

مجھے ابن اثنا کے آنے کی بے حد خوشی ہوئی تھی۔ دعوت میں بڑے بڑے سجادوں اور حضرات سے ملاقات کر چکا تھا۔ لیکن میرا بھرم دیرینہ آیا تو اُن میں سے کوئی بھی یاد نہ رہا۔ بس ابن اثنا کو دیکھتا ایک بلی سی گالی دیتا۔ مسکراتا اور سرگٹ پیٹے لگتا۔ وہ خود بھی زردہ کھاتے ہوتے مجھے مسکرا کر دیکھتا۔ ایک چھوٹی سی گالی دیتا اور پھر سترانے لگتا۔ نہ اُسے خبر تھی کہ وہ مجھے آخری بار گالی دے رہا ہے۔ آخری بار دیکھ رہا ہے۔ نہ مجھے خبر تھی کہ میں اس کے بعد اُسے کبھی نہیں دیکھ سکوں گا۔

ابن اثنا نے بہت تھوڑا زردہ کھایا۔ ریحانہ کشمیری قبوے کے دو پیالے لے آئی۔ یہ پیالے دو روز پہلے رنگ مل سے خرید کر لائی تھی۔ اُن پر بڑی نازک جیسے رنگ کی کلیاں بنی تھیں۔ شاید جیکو سلاو ایکہ کے تھے ابن اثنا نے پیالیاں دیکھ کر کہا۔

”کچھ ریحانہ! جتنی ایسی پیالیاں ہیں بھی لا دو کہاں سے خریدی ہیں یہ؟“

”ریحانہ نے کہا۔“

”آپ یہی لے جائیں۔“

ابن اثنا مسکرایا اور کتھیوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”چلو اس سے کم از کم یہ فائدہ تو ضرور ہو گا کہ تم دوبارہ خرید کر لانے کی زحمت سے بچ جاؤ گی۔“ مسودے نے کہا۔

”انکل آپ ہماری دعوت میں کیوں نہیں آتے؟“
ابن النشا نے اپنے قصورس نماز میں کہا۔

”میں آتے ہی رہتے ہیں۔ اصل میں تمہارے آگے ساتھ ہمارا
دو تونوں کا معاملہ دینے سے کہے۔ کبھی یہ ہمیں دعوت میں بلاتے
ہیں اور کبھی ہم ان کی دعوت میں آ جاتے ہیں۔“

بس یہی کوئی تیس پچیس منٹ میں یہ آخری ملاقات ختم ہو گئی۔ تیس
اکتیس سالوں کا ایک ساتھ کا سفر بس یہی تیس پچیس منٹ میں ختم ہو گیا۔ اپنی
کراچی والی عادت کے مطابق اس نے کلائی کی گھڑی دیکھی اور ایک دم اٹھ
کھڑا ہوا۔

”بس بجتی اب چلے۔“

وہ گاڑی میں پچھلی سیٹ پر جا کر بیٹھ گیا۔ گاڑی کا انجن سٹارٹ ہوا۔
ابن النشا نے بیری طرف دیکھ کر ذرا گردن جھکا کر مسکراتے ہوئے ہاتھ لایا۔
گاڑی آگے بڑھی اور ارہ چمن کا سڑک کٹ کر غائب ہو گئی۔ ہمیشہ ہمیشہ کے
لیے۔ پھر کبھی ابن النشا کو میرے گھر نہ لانے کے لیے۔ سوچتا ہوں اگر وہ پیدل
میرے گھر سے جاتا تو شاید مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا نہ ہوتا۔ لیکن یہ تو
بیری سوچ ہے۔ ابن النشا سے محبت کرنے والے کی سوچ۔

پیدل چلنے والے کی سوچ!

مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ ابن النشا جو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہاتھ ہلا کر
مجھے نہ دھت ہو رہا ہے۔ پھر کبھی مجھ سے ملنے نہیں آئے گا۔ اور میں اگر
زمین کے ساتھ ساتھ سورج کے مدار کے اردوں چکر بھی لگاؤں گا تو اسکا سکڑنا
ہوا چہرہ نہ دیکھ سکوں گا۔

اب عجیب عجیب خبریں آنے لگیں۔ کس نے کہا ابن النشا بہت بیمار ہے۔
ابن النشا لندن میں ہے۔ ابن النشا لندن کے ہسپتال میں ہے۔ اسے کینسر ہو گیا

ہے۔ میں نے اسے لندن خط لکھا۔ اس کے لیے دعا کی۔ اس نے مجھے اپنا
آخری خط لکھا۔ تم کیوں فکر کرتے ہو؟ مجھے کچھ نہیں ہوا۔ تمہیں میری بیماری کی
فکر ہوتی ہے تو اب مجھے بھی تشویش ملتی ہے۔

میں جواب دینے کے لیے سوچ رہا تھا کہ اخبار میں فیرا کی ابن النشا
کی حالت نامزد ہو گئی اور پھر ایک روز میں نے اخبار میں ایک ناگزیر دیکھا
جس کے شیشے سے ابن النشا کا خاموش چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ امتاس
کے کلائی پھول تو گرمیوں کی دوپہروں میں بڑی تیز خوشبو دیتے ہیں۔ ابھی کل
میں لارنس باغ گیا تو امتاس کے اس درخت کو دیکھا جسکی زرد چھانوں میں
ابن النشا اور میں بیٹھ کر باتیں کیا کرتے تھے۔ تھپتھپا گیا کرتے تھے۔ وہ اپنی چھانوں
چھوٹی خوشبو بورت نظیں سنا کر تھکا۔ امتاس کی شاخوں میں زرد چھانوں کے
فالوس لٹک رہے تھے۔ سورج ذرا اوپر آیا تو اس کی کرنوں نے زرد چھانوں
کو روشن کر دیا اور ان کی گرم خوشبو دھوپ میں اڑنے لگی۔ میں نے ہاتھ سے
ٹپٹی کو نیچے جھٹکایا اور زرد چھانوں سے پوچھا۔
”تم نے ابن النشا کا تابوت دیکھا ہے؟“

چھانوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ ان کے اندر کچھ بے تیز دھوپ میں
اور زرد ہو گئے اور پھر گرم ہوا میں ان کی نرد خوشبو گرمی اداں ہو گئی۔
میں نے ہوا سے کہا اُسے دیکھنا وہ کہاں ہے؟ میں نے سوچے پتوں سے کہا۔
اُس کی کوئی خبر لانا۔ میں نے خوشبو سے کہا۔ اُسے تلاش کرنا۔ ہوا زرد گئی۔
سوچے پتے ہوا کے ساتھ اڑ گئے اور خوشبو واپس نہیں آئی۔ اب کون اسکی
خبر لا کر دے گا؟

امتاس کے زرد چھانوں! میرے ساتھ تم بھی طلوع ہوتے سورج کی طرف
اپنا چہرہ اٹھاؤ! روشنی! زرد روشنی! اور زرد روشنی!!

لاہور
۲۲ مارچ ۱۹۳۹ء

پیارے جیسو

تم کہو گے۔ پھر دیر کر دی۔ ہاں ابھی پھر دیر ہو گئی۔ موقع اور
موڈ کی تلاش کرتے دیر ہو گئی۔ اور پھر موڈ کے خطہ نگاہ رہا ہوں لیکن
نگاہ تو رہا ہوں۔ اتنا خود ہے۔ لاہور کوئی مری تو نہیں ہے کہ ہفتہ پھر
سے آسمان ابرا آلود ہو۔ بیٹ لگا مار برس رہا ہو اور سردی کافی تکلیف دہ
ہو۔ یہاں تو عجیب و غریب قسم کا موسم ہے۔ موسم کا احساس ہی نہیں
ہوتا۔ تم جو یہاں نہیں ہو۔ دن اور رات اداس سے گزرتے ہیں۔
آج کل لارنس میں اور مال پر گھومنے کا مڑا ہے۔ کل رات دس بجے چھوڑ کر
جلس اور صفدر آ گئے۔ ان کے ساتھ باہر جا کر تان کباب کھاتے۔
کھینچے ہیں کافی پی۔ اور اس کے بعد گھومتے
رہے۔ بارہ بجے تک گپیں بانتے رہے۔ اور ہنستے اور کھیلتے کودتے رہے۔
پھر صفدر کو مٹھا کوئی کام یاد آ گیا اور چلا گیا۔ میں نے حمید اختر اور یاس
کو غٹوڑی دیر روکا۔ لیکن پھر وہ بھی چلے گئے۔ اور میں اکیلا رہ گیا اور دل
اداس ہو گیا۔

پھر تم پتھر پر بیٹھ کر ناول پڑھنے لگے۔ دھوپ جسم کو پر سکون
گرمی بخش رہی تھی۔ نیچے پھیلی ہوئی وادیوں میں سفید ابر پارے تیر رہتے
تھے۔ اور پھر دیکھنا۔ جنگلوں کی طرف سے آنے والی ہوا میں نمی تازگی
اور ہلکی خوشبو تھی۔ لیکن وہ تازگی اور خوشبو یہاں تک نہیں پہنچتی۔ تم
اس خوشبو اور تازگی کے منہ لوٹ رہے ہو۔ غیر اچھا ہے۔ لیکن تم آؤ تو
یہ تازگی اور خوشبو جو بہار اور امید کی نشانیاں ہیں اپنے ساتھ لے
کر آنا۔ اپنے ساتھ لے کر آنا۔

۲۰۔ تاریخ کو کراچی میں یوم فاکس ہے اور یہ لوگ وہاں جا رہے ہیں۔ کون لوگ۔ حصار۔ قاسمی۔ بیس۔ فٹیل اور ظہیر وغیرہ۔ اس ہفتے ہمارے اجلاس کی صدارت مولانا چراغ حسن حسرت کر رہے ہیں۔ اور ایوب کرمانی ایک طنزیہ مضمون پڑھیں گے اور میں ایک نظم پڑھوں گا ٹیگھائی والی نظم ابھی پوری نہیں ہوئی۔ میں جو نظم پڑھ رہا ہوں وہ آج سے کوئی چار سال پہلے لکھی گئی تھی۔ لیکن آج کے حالات میں اس کا اطلاق زیادہ اچھی طرح ہوتا ہے۔ سپین اب چلنے لگا ہے یہ زمین بھی میں نے خاص طور پر یہ خط لکھنے کے لیے کسی سے مستعار لیا ہے۔ چیرٹی سے مستعار لے رکھا ہے۔

دو تین دن ہوئے۔ مغربی پنجاب کی انجمن ترقی پسند مصنفین کا انتخاب ہوا ہے۔ احمد ندیم قاسمی جنرل سیکرٹری چنے گئے ہیں۔ عبداللہ ملک آرگنائزنگ سیکرٹری اور عمارت خزانچی۔ بہت اچھا انتخاب ہوا ہے۔ مجنی اور عبدالسلام خورشید وغیرہ نکل گئے ہیں اور ان کی جگہ ظہیر وغیرہ کو لیا گیا ہے۔ چند دن ملک لاہور کی انجمن کا بھی انتخاب ہونے والا ہے۔ تاریخ کا ابھی تعین نہیں ہوا۔ ملک وغیرہ کا خیال ہے کہ سیکرٹری حصار کو اور تمہیں بنا دیا جائے۔ اس میں میری CONVISSING کو کوئی دخل نہیں۔ عاف بات ہے۔ اب

یہ ہے کہ تم آؤ تو پتہ چلے کہ تم کہاں رہو گے۔ اور ذمہ داری کے کام کو دیکھ کر نہیں۔ میرے لیے سب سے بڑی بد خبری یہ ہے کہ ہمارا دفتر شاید بول ٹک کو اپنی منتقل ہو جائے۔ میری کوشش اب بھی یہی ہے کہ یہاں میرے لیے کوئی رہنمائی کیلئے مائل آئے تو نوکری چھوڑ کر یہیں رہ جاؤں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے روزگار کی کوئی سیل یہاں نکلے گی نہیں اور مجھے طرہ و کرہ جانا پڑے گا۔

اور سب دوستوں سے ایک مستقل جدائی ہو جائے گی۔

ہاں جان من۔ میں مارچ کی ۲۶ تاریخ کے لیے جیم بولہاں۔ آج ۱۶ ہے اور تمہارے کہنے میں سات آٹھ دن کا وقفہ ہے بشرطیکہ تم اپنے پروگرام اور وعدے کے پابند ہو۔ میرے دوست ضرور آج آؤ۔ شام بارہ بجے میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ اسی روز دیکھیں گے۔ تم تو پہلے بھی دیکھ چکے ہو اور اسی روز شورش نے بھی دیکھا دیا تھا۔ اب کے پھر شورش نے جان میں جھک ماری ہے۔ لیکن چھوڑ دو۔ کون پروا کرتا ہے۔ میرا ٹیگھائی والا مضمون اس ہفتے کے نظام میں آ رہا ہے اور نظام نے ترقی پسند روش پر چلنا منظور کر لیا ہے۔ اس میں ہفتے کے ہفتے ہماری رپورٹ بھی چھپا کرے گی۔ اور باقی بھی کئی تبدیلیاں ہوں گی۔ (ان میں انتظار کی تہریل شامل نہیں ہے۔)

ماہر نے تمہاری پوچھو دیکھنی تھی۔ وہ میں بھیج رہا ہوں۔ بس معمولی قسم کی تصویر ہے۔ حسیطہ نے تو تصویریں بھیجی ہیں وہ بہت اچھی ہیں۔ اچھا تو پیار سے دوست۔ اب رخصت۔ میرا یہ خطا ہے رنگ دلہستہ لیکن رنگ و بو کہاں سے لاؤں۔ تمہارا انتظار ہے شاید تمہارے ساتھ رنگ بول بھی آجائے۔

ابن اثنا

یہ ہے وہ نظم جو میں اب کے پڑھ رہا ہوں۔ اس میں طوفان طواری تحریکیں ہیں اور ساحل وغیرہ رجعت اور سامراج کی نشاندہی کرتے ہیں۔

آج کا طوفان

موجوں کے مزاج میں دھڑگوں
کچھ کر کے رہے گا آج سمیوں
شاید بھی آخری ہو طوفان

ساحل پھر نہ ہو سکے نمایاں

جہاں ہوئی دم کی سیخ خاموش
پیدا ہوا موجِ خفتہ میں برش
لڑہا ہوا منہروں پہ طاری
بہت ہوئی گہدوں میں ساری
دشے میں ہیں آنہیں چٹانیں
بہم بڑھی آ رہی ہیں موجیں
سگرنے پال چل رہا ہے
طوفان نیا کُڑھ بدل رہا ہے۔

لیکن اے رفیقِ ہم نے اکثر
دیکھا ہے قیامتوں کو عسریاں
اٹھتے ہیں نہ جانے کتنے سیلاب
بکھے تھے جنہیں نجات سداں
پلپا ہوئیں رفتہ رفتہ موجیں
ساحل ہوا دم دم نمایاں
مور کے ستوں قلاعِ خارا
تاریخِ غروبِ دیوِ طوفان
تانے ہوئے سینے بھر سے ابھرے
پانی کے وسیع دانوں سے

طوفان کا تم آج رنگ دیکھو

ماہی کی کہانیاں نہ چھینڈو
آج اپنے شباب پر جنوں ہے
ہر قسمِ بند سرتوں ہے
پشتوں کی عمرانیاں مسلم
پانی کی صفیں بھی ہیں مستقم
لڑہا سا ہے ہر بنا پہ طاری
بہت سی ہے گہدوں میں ساری
پیروں سے نکل گئیں چٹانیں
بہم بڑھی آ رہی ہیں موجیں

ساحل نے جن کیے ہزاروں
روکے سے نہیں رُکے رداقی
قلوں کے وہ مرمیں خارے
ایاتمِ ستیق کی نشا فنی
مذہب کی وہ خاتواں ہیں سے
زندہ تھیں روایتیں پرا فنی
وہ سیم نگار قصہ درالواں
آیاتِ شکوہ قبرستانی
دھڑکی پر پڑے ہیں سرسجدہ
بڑھتا ہے مزے مزے سے پانی
موجوں کے مزاج ہیں دگرگوں
کچھ کر کے رہے گا آج جموں
شاید ہی آخری بو طوفان
ساحل پھر نہ ہو سکے نمایاں

دیوارے جیسے

تم بہت دلوں سے میری آنکھوں کے سامنے ہو میرے دل میں
میں رہے ہو۔ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں اس کی کوئی
وجہ نہیں ہیں۔ ایک تو یہ امروز میں ہفتے کے ہفتے کتابوں کی دنیا کا کلام
کھٹکا ہوں ادب ایک تھک تھکے ناول پھیل اور ناول کے علاوہ تھک تھکے ان
افسانوں پر جو نقوش اور مہلک لکھنٹ میں چھپے ہیں تھمرے کر چکا ہوں۔

امید ہے اس ہفتے تم سے دور رہے پر تبصرہ کروں گا۔ تمہارا ناول بڑا اچھا
ہے۔ لیکن کئی پسوؤں سے قریب مجھے زیادہ پسند ہے اور انہی پسوؤں
سے ساواہ بھی۔ جزئیات نگاری اور ظرافت کے تم بادشاہ ہو۔ میلوڈراما
بھی اچھا لکھتے ہو اور شفیق الرحمن کو مات پر مات دے رہے ہو لیکن میرے
ایسے آدمی کو جس کی زندگی میں محبت کو کبھی دخل نہیں رہا۔ سبیل کے نام
قلم کی چیزیں کیسے پسند آسکتی ہیں؟ ہاں وہ تمہارا قبرستان سے خط جو
ادب میں چھپا تھا یہاں بہت پسند کیا گیا ہے لوگوں نے اور تم سے کیا
پردہ میں سے اس کا پرنٹنگشٹا ابھی کافی کیا ہے پھر عجیب اتفاق ہے
کہ جس وقت تمہارا یہ اجتماع اور میرنگ خط (حرام زادہ) طابع اس وقت
میں گورکی کی آب بین کا دوسرا حصہ پڑھ رہا تھا اور وہ جہاں چڑکا اور
سکا کلام آتا ہے (تم نے غلط طرز کیا ہے چڑکا میرا نام ہے سکا تمہارا۔
فوت کرو) اور جہاں کالی بی کو تو کھا گئی تھے والا گیت ہے اور اس
سے پہلے میں نے تمہارا پروردگار ہادیاں ابھی ختم ہی کیا تھا۔ مجھے وہ
بہت پسند آیا لیکن اپنی ممدوی اور قید اور موری پر آہ بھر کر اور دلچسپ
موس کر رہ گیا۔ تم آؤ گے چیتھے جو۔ کیا تم سے میرا مزاج (اور قلم) (اور قلم)

کچھ ایسا ہوا ہے کہ قہیں دیکھ کر دل کا کنول فوراً کھل جاتا ہے۔ اگر تم
لو کی بھرتی اور میرے لئے میں رہتے تو میں تمہارے ساتھ شادی کرتے
کے لیے ہزاروں جتن کرتا اور تم شادی نہ کرتے (یا نہ کرتیں) تو خود کشی
کرتا۔ اصرار شادی میں (اگر کرتا) تو یہ جانتے ہوئے کہ تم میرے
نگاہ کے باوجود مجھے کے ہاتھ چھیلے فوجی اڑاؤں سے..... لیکن ایسا بہت
بڑھانے سے حاصل۔ تم چڑکا کی زبان میں کہو گے۔ "بھتیجیہ تو تیری کپ ہے۔
پر تو توبے پر کی اڑا رہا ہے۔" لیکن اتنا کہوں کہ تم پر برق بھٹنا
بہت خوب اور بیکھوڑو مود پر دم گزرتے (یا گزرتیں) تو احمد راہی لکھنا
حضور اور وہ شخص بھی جو "مجلد نوری" میں منظر ہے طوطی سے بلند (ظہیر)
تائے میں تمہارا اچھا حضور کرتا۔ اور شام کو تم پکانے کے لیے گوجی
چیرتے۔ سونے کے بندوں کے لیے قہنہ کرتے پکی روٹی اور چٹنا مر
کالا پڑھتے۔ اور اپنی تین سالہ بیٹی کینز ناظر اور چھماکے کے تذکر
اچھڑا کر ہڈی احمک طرف اشارہ نہیں آکھتے کہ تم دیکر کا منظر
کا پاس بیٹھے والا خود دیکھنے جاتے.....

اس سے تم پر واضح ہو جائے گا کہ جس قسم کے بعض میلوڈرامائی
خط اور مضمون تم لکھتے ہو ویسے میں بھی لکھ سکتا ہوں۔

پھیل اور کنول کا دیوید امروز میں چھپا تو یہ غضب ہوا کہ کاتب
نے سب جگہ "پھیل اور کنول" لکھ دیا اور مجھے طے میں آکر امروز میں ایک
خط لکھا پڑا۔ اس کا تپ نے مندر کو مندر بھی لکھا تھا۔ میں پر میں نے
بہت غور کیا اور امروز کے کاتب مجھ سے ناراض ہو گئے۔ کل میں
نے تمہارا پروردگار ہادیاں پڑھنے کے بعد مولوی عبدالحق نیازی ابی سہل
(اردو) ایسے (فارسی) سابق پرنٹنگر کالج اور سائٹ پرنٹس
اردو کالج کو پڑھنے کو دیا۔ وہ میرے COLLEAGUE ہیں۔ میرے دہنے

باقیہ بیٹھے ہیں اور میں نے قضا میری گنہ گار بنی سے تین آنے قرض
لے کر چھڑایا تھا۔ دادیاں پڑھ کر وہ ناک بھوں چڑھا کر بولے (ان
کی عمر ۵۵ سال ہے اور دماغی مضر ہے) اس میں قتل و لڑائی کی
کوئی چیز نہیں ہے۔ کوئی تعمیری بات نہیں کیا تاہم ایسی باتیں کہنے سے۔
خود وہ نہیں سمجھتے ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کی حالت دار کے مرثیے
لکھتے ہیں۔ اقبال کے کلام میں تصوف کے موضوع پر ایک متعلقین
فرما رہے ہیں۔ کراچی آؤ تو طائفات کراؤں۔

تم ادب کے میدان میں پوکڑیاں بھرتے ہوئے آئے بڑھتے جلتے
ہو اور میں اتنا پیچھے رہ گیا ہوں کہ اس سال کچھ نہ لکھا تو فساد
لوگوں سے کہا کروں گا۔ یہ شخص اسے جیسے۔ یہی جو مشہور انسان
نہا رہے۔ میرا بہت اچھا دوست ہے۔ میں میرے بدلنے اس نے کھنا
خروج کیا بلکہ شروع شروع میں تو مجھ سے اصلاح بھی لیتا رہا ہے۔
اچھا لڑکا ہے۔ اور ترقی کرے گا۔ اس کا اکثر وقت میرے مکان پر گزرتا
تھا۔ فلاں انسان لاپلاٹ میں نے اسے بتایا تھا اور اس میں جس
بارنا کا تذکرہ ہے وہ وہ بار ہے جو ہمارے گھر کے چھپے ہے۔ وغیرہ۔
مجھے انتظار حسین بھی پسند ہے جو سر پر تو بانڈھ کر میکا ٹیک دوپہری
میں انسان لکھتا ہے اور ان کے پتے پر ڈنٹر پیل کر شینا اور دنیا قسم
کے غیر خالی کردار تخلیق کرتا رہتا ہے۔ تمہیں یہ سن کے تعجب ہو گا کہ ایک
نقاد جلال الدین احمد نے پاکستانی گارڈی (انگریزی) میں ایک
مضمون لکھا ہے جس میں میرا نام تھا جسے انداز میں سید کے ساتھ لیا۔
اشفاق احمد کی تصویر بھی چھاپی ہے۔ شوکت صدیقی۔ اور اور جلیں کا
باکس ذکر نہیں کیا۔ حیرت ہے

میرا حال تم نے دیکھ ہی لیا۔ میرا بارود قریب قریب ختم ہو گیا۔ اب کے
ایک بہت گھٹیا قسم کی نظم مکمل تھی وہ مرزا صاحب نے ادب لطیف میں
سب سے پہلے چھاپ کر میری رسوائی کا سامان پیش کر دیا۔ تو نظمیں
اچھی ہیں۔ یعنی میری پسند کی ہیں ان میں سے کوئی پوری نہیں آتی
مرزا جہاں اور طنزیہ مضمون لکھنے میں میں جھکتی رہ گیا۔ میری کتاب۔
نثار گندم یہاں سے چھپنے والی تھی مگر میرے پاس مضمون ہی پرے
نہیں۔ سوچتا ہوں تم لوگوں سے اور لاہور سے دوری تو اس کی وجہ
نہیں۔ اگر میں نے آئندہ چھ مہینے میں کئی مضمون اور نظمیں لکھ
دیں تو نہایت میرا فائدہ پڑھنا۔

اچھا تم تو مصری شاہ میں رہتے ہو تمہیں سب سے پہلے Aoyantra سے
یہ ہے کہ تم نے گیتا دیکھی ہے۔ میں گورکھ کی کتاب پڑھتے وقت تھلاؤ
مندی کتاب پڑھتے وقت گورکھ کی کتاب لکھ کر بغیر نہیں رہ سکتا۔ آج کل کسی گورکھ
ہے۔ اب میں بہت اداس ہوں۔ تم مجھے دوسروں میں تنہا ہوں مجھے آہنی بھونکے
دفتر کے میز کے ساتھ گھونک دیا گیا ہے۔ میری گھر بیوی اور بچے
اور پریشانیوں نے میرا امن و سکون چھین لیا ہے۔ میری عمر ۶۹ سال
ہو چکی ہے۔ دس سال کے اندر اندر میں پوری طرح بوڑھا ہو جاؤں
گا۔ میرے بال ابھی سے سینہ ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ مجھے گورکھ کی
نانی پر ہجرت ہوتی ہے جو ایسے احوال میں رہتے ہوئے بھی جبکہ نانا
صاحب نے انہیں الگ کر دیا تھا کہتی ہے۔ میرے اندر یہ دنیا
کتنی جیل ہے۔ میرا بس پتے تو میں قیامت تک نہیں دہوں۔ اور
جو آئندہ دس آنے کا بیٹے ہے تو اسے خیرات کے طور پر دے دوں گی
کھڑکیوں کے پیچوں پر رکھ آتی ہے۔ خفیہ خیرات کے طور پر۔

میدانِ جیل سے رہا ہو گیا۔ آخر اسے جیل میں کیا تکلیف تھی؟
ایک صاحبِ دہلی سے آئے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ اس کے مرے بال
چھڑ گئے ہیں۔ یہ سب نظر بندی کا کھیل ہے۔ مجھے عبد المتین عادت کا
خیال آتا ہے۔ مجھے وہ شخص بہت پسند ہے۔ بہت مخلص دوست
ہے لیکن معلوم نہیں اس کا نام سن کر مجھے بے اختیار ہنسی کیوں آ
جاتی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی شکل کے ساتھ کیونرم
کا جوڑ کچھ شبیہ نہیں بیٹھتا۔ اب تو رہا ہے وہ کہیں پڑھ رہا ہے
اس کے بعد کسی استادِ برافق اسکول میں شجرہ جو جانتے گا اور بڑوں
کو چوڑی سڑکوں کا رقبہ نشان سکھا یا کرے گا لیکن اگر بھٹوں اور
ناہوں کو اسراں بھساتے وقت اس نے اجدیاتی مادیت کے سوال
بجھائے مژدع کر دیتے تو بڑی مشکل ہو جاتے گی۔ ہماری آئندہ شکل
بالکل ہی ان پڑھ رہ جاتے گی۔ احمد آبادی کو کونجھے تعجب ہوتا ہے
اس نے کڑھائیاں مانجھنے۔ قلابین کی بٹم رنگنے اور شام کو اکھاڑے میں
میں دو دو ہاتھ کرنے کے بجائے یہ دس بارہ جامین کیسے پڑھ لیں اور
پڑھ میں تو آنا پیسنے کی چکی کا نقش ہونے کی بجائے شاعر اور ادیب
اور ایڈیٹر کیسے ہو گیا۔ دراصل انہی چھوٹی چھوٹی حیرتوں باتوں ہی
سے تو خدا کا وجود ثابت ہے۔ قاسمی صاحب کا نام آتے ہی غائبانہ
آنکھیں جھکائیں گے کہ وہ چاہتا ہے اور ملک کو دیکھتے ہی اسے چٹ جاتے۔
اس سے گالیاں سننے اور لاہور کے ادبی اور سیاسی حلقوں کے انتہائی
اندرونی معاملات دریافت کرنے کا جیون پاؤں کے تلووں سے گھس
کھوپڑی کو چٹھا کر نکل جاتا ہے۔

اسے پیارے لوگو تم دور کیوں ہو

میں نے لاہور چھوڑنے کے بعد جتنی نظیں اور قیر کے رنگ میں

جتنی غزلیں لکھی ہیں سب میں دوستوں سے بھرائی اور
کاپت شدہ بد اسس پایا جاتا ہے۔ ایک غزل کا مطلع تھا:
انشاء ابھی انہیں میں ہیں سے باقی تر کئے
جن کی خاطر بقی چھوڑی نام نہ لو ان پیاروں کا

۲۱

اب تو تھانوں کا باغ مرجھا رہا ہے اور صرتوں کا دامن پھیل رہا
ہے اب زندگی "فراختے وکتا ہے وگوشہ پختے" ملک محدود ہو گئی ہے۔
زیادہ تر کھنے کی دیر بھی رہی ہے جب میں آسانی سے اپنے سے اپنے
ایروں کی کتابیں خرید کر مہابت المہینان سے پڑھ سکتا ہوں تو مجھے
خود کچھ لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ ان تم کراچی آؤ تو کافی ہاؤس میں
بیٹھیں۔ کھفتن پر گھوٹیں۔ کبھارنی میر تیل آلود سمندر میں کشتی کی سر
کریں۔ طویل شام اس کالے پل پر گزاریں جس پر شنگائے مضامین
نظم لکھی تھی۔ اور ان چند دنوں میں میں اتنے تھکے ماروں کہ باقی
مرے کے بے پناہ ہو جاؤں۔

لیکن جیو تم خط تو لکھو گے، اسے یہ تو تیری گپ ہے!

ابن انشا

پیارے؟

اب میری درد بھری کہانی پڑھ کر ڈکی زبانی سنو۔ لاہور سے آنے کے چند دن بعد میرا *RELEASE* ہوا اور میں دس دن کے لیے بائیں فرش پر ریت گیا حتیٰ کہ ٹائیٹنڈ کی سیٹج آگئی اور ڈاکٹر نے انجاش دیا۔ مجھے ٹائیٹنڈ سے ڈر آتا ہے اس لیے تندرست ہو گیا۔ تندرست یہاں بقوی معنوں میں استعمال نہیں ہوا۔ *FIGURE OF SPEECH* کے طور پر کہہ رہا ہوں کیونکہ اب بھی میں آنا ٹیف اور بیمار ہوں کہ دفتر میں بیٹھنا اور کام کرنا خارج از بحث ہے۔ آدمی فریالگ بھی جانا ہو تو رکش میں لے کر جانا ہوں اور ڈاکٹر کہتا ہے کہ لازماً ایک ماہ اور آرام کرنا پڑے گا۔ یہ آرام آدمی تنخواہ پر ہو گا اور میں سڑب الفیورڈ نہیں کر سکتا۔ انجاشوں اور ٹائیکوں کا بغا ہر کوئی اثر نہیں ہوا بس تمہارا خط آنے سے کچھ اطمینان ہوا ہے لیکن مزہ پر رونق آنی کی حد تک نہیں۔ اب نہ کہیں جاتا ہوں نہ کسی سے ملتا ہوں۔ ایک نامزد خط کا بھی اسی وجہ سے ہوا۔ ایک۔ پارسول پیج رہا ہوں لیکن *SEARCH* کرنا پڑتا ہے اور اس کی ماضیت ہے۔ شاید مجھے یہ مکتوب نوٹس *SUSPEND* کر دینا پڑے خصوصاً اس لیے کہ ٹیک کر دینا میں ڈال "والا معاملہ معلوم ہوتا ہے۔ اگر اعلیٰ کلاں کسی نے کچھ جیسا بھی تو میری توقع اور عزت سے اتنا کم ہوگا کہ مجھے صدمہ ہوگا۔ میں یہ کام بڑا ناگوار کرنے کو تیار ہوں ورنہ نہیں۔ اس لیے کہ کالج میں پڑھتا ہوں اور صرف پڑھائی کا فری - ۱۵ ماہ ہے۔ یہ بات کو بتا دینا۔ جو کچھ بھیجتا ہوں وہ بالکل گھٹیا مگر جیت ہوں لیکن یہاں کراچی میں خصوصاً یہ چیز بہت مقبول ہوتی۔ انکار والے زبانی معلوم نہیں کون لکھتا ہے! میرے پاس اس کی تعریف

کو رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ تم بھی ایسی چیزیں لکھو۔ وہ سمجھے کہ اسے جیسے لاہور میں بیٹھا بیٹھا یہ سب کچھ لکھ رہا ہے (حالانکہ تم اتنا گھٹیا نہیں لکھتے)!

جان من۔ تمہارے خط زندگی بخش ہوتے ہیں۔ ایک خط آج ہی لکھ دوںیں۔

تھامرا
پڑکا

ہمارے عہد!

تھارا چھوٹا سا پلٹ کارڈ ملا تھا جس میں یہ وعدہ معشوقانہ
(جو کبھی وفا نہ ہو) موجود تھا کہ تم مجھے جلد ہی دوسرا اور منفصل خط
لکھو گے۔ وہ خط تم آج لکھتے ہو۔
دیں اثنا نگارش میں قہار تحریروں والا مضمون دیکھا تھا میرے
ہاتھ اور قہار نہ چوم لینے کو بھی چاہتا ہے۔ اگر دو چار سال میں حالت
رہی تو ہم جیسے لوگوں کو قہار شہرت کے قلب بینار کی طرف پگڑی سنبھال
کر دیکھنا پڑے گا۔ پودھری نذیر کا ذکر تو سہاں الٹ — تم اسے اچھے
”ٹھکے ہو“

اب بہت خوش مدہ ہو چکی قہار اب مطلب کی بات یہ ہے
کہ جلد خط لکھو۔ ورنہ میں مرجاؤں گا۔
آج کل کی حال ہے قہار۔ نظام سے کیا منہ ہے اور پلازا کے
مہلوں کی ایک مارکٹ سے سگریٹ کے دام نکل جاتے ہیں یا نہیں؟
یہ خط جو مخلوف ہے بصورت مضمون چھاپنا چاہو تو چھاپنا کو اور
گھٹیا تنقیدی معاینات چھاپو۔

قہار

پڑ کا

مات کے بچوں کو کچکارنے سے قہار کیا مطلب ہے؟ مرزا اب
کا ذکر ڈراما DAMAGING ہو گیا ہے کہ نہیں؟

جان کن اردو دوران من اے حمید!

قہار اور مسری مجھوں کا رو کبھی بھی مل جاتا ہے اور کبھی بھی ہر گز
انصاف بھی نہیں اس سے میرا ہیٹ نہیں بھرتا۔ جی تو چاہتا ہے کہ تمہیں دل
کے ٹپٹے میں بٹھاؤں۔ جس سے اشتراک سین و فز کو ٹپٹے میں پری لانا
کا عاودہ کئے اور دل کے آئینے میں ہے تصویر یار کا گھینا شعر گنگانہ
کا موقع مل سکے لیکن بس نہیں چلتا اور اس دنیائے لافانی میں کسی
پر کسی کا بس نہیں چلتا۔

اب سنو ایک بات مطلب کی۔ ہر گز گل کا پھلا پرچہ میرے
بھائی نے تمہیں پیش کیا ہو گا۔ دوسرا پرچہ اچھا نکلے گا اور بازار میں
بھی آئے گا۔ مگر ہے میری اور تم میں یہ آخری پرچہ ہو گا کیونکہ اس
کے بعد میں فارغ التحصیل ہو جاؤں گا، لہذا میں چاہتا ہوں کہ قہار نام
کسی نہ کسی طرح اس سے ASSOCIATE ہو جائے۔ ہر گز گل کے
یہ قہار کوئی مضمون مل گیا تو یوں کچھ لوں گا جیسے تمہیں گئے لگا لیا ہو۔
جیسے کسی برکھ کو شام میں لارنس کی طرف نکل گئے ہوں۔ جیسے تم میرے
چینی کا ایک میں میرے باگل پاس بیٹھے دنیا جہان کی حیرت انگیز باتیں
کرتے ہوئے دنیا جہان کے پودہ گرام بنا رہے ہو۔ اور ان قہاری لہجی
تصویر بھی چاہتے ہو اور کہیں نہ چھپی ہو۔ ہمارے کالج کی ٹیوٹور کو تم
بت بلند ہو (مجھے اس لیے اس پر اور تم پر غصہ بھی آتا ہے) اس لیے اس
فرائض میں تار حقن کرام کا پڑنور اصرار بھی شامل کچھ لو۔ اور یہ بات دیکھ
لو میں یہ نہیں چاہتا کہ تم ایسا مضمون بھیجو جو ایک بار دیو پو پو چھینٹیں مار
روزناموں میں چھپ چکا ہو۔ اگر SERIOUS واقعہ منہ پانی نہیں لکھو
تو LIANT قسم کی چیز بھیجو۔ دیکھو مزید بھیجو (حرام اڑا ہے تو نے داستان

مزید مزہ مجھے نہیں بھیجی۔ سارے ریلوے کو دیتا اور قہیں پلٹس سے زیادہ
(درج دیتا)۔ ورنہ میرا ارادہ ہے کہ تھارے بعض خطوط کو شائع کروں
ایک میں بینک کی لڑکی کا منہ چومنے کا ذکر ہے جو ناک پر دو مال رکھ
کر یوں آتی ہے جیسے نسلانی نہ صاف کر رہی ہو۔ اور باقی خطوط میں تو اس
سے زیادہ ہمزہ دگیاں ہیں۔

ہنس پیارے تھوڑا لکھے گو بہت جانو۔ ایک کہانی یا مضمون یا
طویل خط لکھنے اشاعت، ہم دونوں کی رفاقت کی یاد مجھے بھیج دو۔ اپنی
ایک یا دو تصویروں کے ساتھ۔ ایک میں اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں تاکہ
جب فراگردن جھکاؤں دیکھ لوں اس لیے کہ تم پر پیار بہت آتا ہے۔

(ابن انشا)

۹ جون ۱۹۵۲ء

بھید!

تم اپنے ڈیڑھ ماہ پہلے کے خط میں رقمطراز ہوئے تھے۔
"..... اگلے ہفتے تمہیں ایک بڑی خوب صورت شے روانہ
کروں گا۔ بے فکر رہو....."
میں ابھی تک بے فکر ہوں۔ تم اپنی کہو۔ کیسے کیسے کے۔

ابن انشا

تھیرہ۔ تم جیٹی آدمی ہو۔ پرلے درجے کے گرسے ہو۔ میری طبیعت بہت دلفن سے برز حاضر اور ناساز ہے۔ ایسے عالم میں جو خطو کھول کا ظاہر ہے ویسا نہیں ہوگا جو میں ہر فانی جو شہ و خواہی کھتا ہوں۔ میں نے سنا تھا چٹان میں شاہد صاحب نے کھائے متعلق کوئی بہت اچھی رائے ظاہر کی ہے اس لیے میں نے کھدیا اچھا لعنت بیجو۔

اب ساقی میں طاہرہ احمد کا مضمون دیکھ کے ٹھٹھ گیا۔ تمہارے متعلق اس کی رائے اچھی ہے۔ میں نے جیل اور کنول کے ریویو میں بھی کچھ لکھا تھا۔ اب کے ساقی میں میرا جو کلام ہے وہ بھی پڑھا؟

ابن انش

ڈیرے عسید!

تمہیں اسنے دن جواب نہ دینے کا گنہگار ہوں اور آج بھی مختصر کھ رہا ہوں۔ اس کی وجہ بتانا ضرر گناہ بدتر از گناہ ہے۔ سب سے پہلے اپنی کتاب کی سٹو۔ تم نے مجھے لکھا کہ چھ کاپیاں بھیج رہا ہوں۔ پانچ فلاں فلاں پڑچوں کے لئے اور ایک تمہارے لیے۔ پانچ تو غیر مکمل آئیں جن پر چوں کے نام لکھے تھے اور چھٹی جن پر تمہارے اس آبا جان کا نام لکھا ہونا چاہیے تھا ظاہر ہے کہ نہیں نکلی وجہ یہ کہ رکھی رہی نہیں گئی تھی۔

سو ایک کاپی تو میں نے رکھ لی۔ دوسری کا ریویو اشباع میں کیا گیا۔ باقی رہیں تین۔ ان میں سے ایک رفیق قادی کو ریویو کے لیے پہنچا دی اور جب ان کے ہاں ریویو کی گنجائش نکلے گی اس پر بھی ریویو آئے گا۔ شاید اگلے ماہ آئے۔ ایک ممتاز حسین کو سیارہ کے لیے دی گئی اور معلوم نہیں اس وجہ سے پاکسی اور بنا پر۔ وہ سیارہ سے الگ ہو گئے۔ اب کتاب ان کے پاس ہے لیکن سیارہ ان کے پاس نہیں ہے ایک کاپی امروز میں دی گئی۔ جس کی رسید تک نہیں ملی

نظم تم نے پسند کی۔ سارے تم بھی مذاق کر دو گے؟ رفیق خاں کو ۳ تاریخ کا سمن مل گیا ہے۔ اس کے دفتر والوں نے اسے 50000 روپے بنایا ہے اور کہا ہے کہ تم پر ایک ٹیٹ طور پر اپنے حقوق پر مصافی کا انتظام کرو۔ بری ہو گئے تو مناسب فرج مل جائے گا۔ نہ ہوتے تو معلوم نہیں کیا ہو گا۔ بہر حال یہ ان کے دفتر کا راز ہے ضروری نہیں تم اسے پھیلانے چھو۔ میں یہ جان چاہتا ہوں کہ تمہارے ساتھ

معاذ کہاں تک ہے۔ آتے ہوئے صاحب اور دوسرے معززین
سے صفائی کی تقریریں آنا۔ مولوی عبدالحق سے میں نے لوں گا۔
شاہ صاحب وغیرہ سے بھی۔

تھارا
ابن اث

تخلیق کر لی

۱۳ جولائی ۱۹۵۶ء

پیارے!

اس دنیا کے ہدفم سے طاقت نہ ہوئی۔ اس میں میری مصروفیت
اور عوم کا بہت تصور ہے۔ لیکن تمہاری ہماری محبت کوئی طاقتوں کی
محتاج نہ توڑا ہی ہے تخلیق کے اندیشہ خواہ صاحب میرے دوست ہیں
تم تو ان سے ملے بھی تھے۔ پرچہ اچھا نکالیں گے۔ فرداً ان کو کافی دو۔
VMP بھیجو۔ تم نے کافی مذہبی تو ہیں تمہارے پیسے جو مجھے اپنے
پرے کی طرف سے تمہیں دینے ہیں، دیا جاؤں گا۔

حذیفہ کو سلام، اس کی صحت اچھی ہے۔ پچ جالو تم سے دوبارہ
نہ ملنے اور حذیفہ کی رحمت رکھانے کا زلی ملا ہے۔

مستعود کا پتہ مجھے بھیجو۔ وہ کتابوں کے ڈیزائن بنانے کا کیا
یتا ہے۔ مجھے اس کو چربی نظموں کے بارے میں خط لکھنا ہے۔

بھیا
ابن

دیار سے محسوس!

تم نے ایک روز ڈھائی سڑکا رسمی خط لکھا تھا اُس کے بعد چپ ہو گئے۔ میں اس قسم کے تجربے برداشت نہیں کیا کرتا۔ میرے منہ بات کیا کرو۔

نظام مل رہا ہے۔ واقعی اب اچھا ہو رہا ہے۔ تمہارے کام بہت اچھے ہیں۔ مثلاً وہ جگہ رہا ہے اور بے آواز ہے، کی یہاں بہت تعریف ہوئی ہے۔ باقی مضامین میں بھی لطافت و مزاح کا رنگ آ رہا ہے جو پرچے کی کامیابی کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ لو بس اب کچھ لو کہ میرا مضمون آیا کر آیا۔

اب ادب لطیف کا طویل مختصر افسانہ ممبر بلا ہے۔ تمہاری کہانی ابھی پڑھی نہیں سلات کوئیٹ کر منے لے لے کر پڑھوں گا اور پھر اس کے متعلق بات کروں گا۔ اس وقت تو میری جان تھکا رہی ہے کہ تم خط لکھو جس میں گالیاں دو۔ اگرچہ تم بھی ابھی طرح جانتے ہو، میں گالیاں کھانے کا نہیں بلکہ پیار کے جاننے کا مستحق ہوں۔ بس صبح ہی سے تمہارے۔ روایتی انداز کے محبوب خط کا انتظار شروع ہے۔

ابن انش

کراچی
۶ ستمبر

پیارے عیسیٰ

تمہارا پیارا خط ملا۔ اس کے بعد میرا مضمون خط بھی ملا جو گا نہیں۔ انہی افسردہ طبیعت میں بہت ہے۔ مدد زت نہیں کرتا۔ دو چار ہی روز میں تمہارے خط کے شایان شان جواب دوں گا۔ تم نے اُس نوکیلا ذکر کر کے تو۔ اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے اچھا میاں اپنی اپنی قیمت ہے۔ یہاں بہت سے لوگوں کو شک ہے کہ میرا تم سے کسی قسم کا ایسا دلچسپ تعلق ہے۔ کاش ہو نا۔ یعنی یہاں اتنی ہی حسرت ہے اور تم جو کہ بیٹھے بیٹھے میری چھاتی پر مونگ کیا سب کی سب دالیں بیک وقت دل رہے ہو۔ کاش تم ایک بار کراچی آ جاؤ۔ یہاں کئی لوگ تمہیں دیکھنے کے شائق ہیں۔ لطیف یہ ہے کہ تمہیں دیکھ کر ان کی غلط فہمی دور نہیں ہوگی اور تقویت پزیر جائے گی۔ (دیکھ FLATER کرنے کا نیا طریقہ!)

الزحلال صاحب کا خط ملا جس سے معلوم ہوا کہ انہوں نے احساس کو چھوڑ دیا۔ اب کے احساس میں لذت رنگ اور روسیہ دونوں کاٹوں میں روئے سخن ابھی کی طرف معلوم ہوتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ابھی خاصی بد مزگی ہو رہی ہے۔ میں اپنی شکل تم سے اپنے پہلے خط میں با تفصیل بیان کر چکا ہوں۔ میں نے اس ADVENTURE میں تمہاری وجہ سے ہاتھ ڈالا تھا۔ امیں احسان دھرنے کی کوشش نہیں کر رہا ہوں۔ احسان کرنے کا تمہیک طریقہ تو یہ ہے کہ تمہارے پرچے کے لیے محنت ایک خط ہر پچھتے لکھوں۔ بہر حال میں ہوا میں لکھے رہنا پسند نہیں کرتا

اور نہ لاچکر کے تمام ہفت روزوں میں باری باری لکھنے کا خواہشمند ہوں۔
میں نے ایچ جی یا غلط طور پر (اساس کے ایڈیٹر عباس احمد عباسی صاحب
کو بھی سے میرا اچھا خاصا واقعات ہے۔ ایک خط لکھا ہے جس میں یہ
نوٹجری دی ہے کہ میں عدم ادائیگی معاوضہ کی وجہ سے یہ سلسلہ بند کر
رہا ہوں۔ الزجبال تمہارے دوست ہیں لیکن تم میرے عزیز اذجان
دوست ہو۔ مجھے روح کی گہرائی تک جانتے ہو اور مر و مغفول ہو۔
اس لیے غالباً میرے طرز عمل کو قابل اعتراض نہ سمجھو گے۔ البتہ اگر تمہارے
نزدیک میرا اقدام غلط ہے تو میں سو فیصدی تمہارے مشورے پر عمل
کرنے کو تیار ہوں۔ الزجبال صاحب سے براہ راست میری اتنی رسم و
راہ نہیں زمین ان کے مزاج کا واقف ہوں۔ تم میرے ادا اس کے
دوست ہونے کی بنا پر مجھے تنہیک مشورہ دے سکتے ہو۔ یہ مشورہ مجھ
تک رسے گا اور تمہاری پوزیشن کس طرف سے HAWARD ہونے
کا قطعاً سوال پیدا نہیں ہوتا۔ تم یہ بتاؤ کہ اگر احساس وائے بقاعدہ
پہلے دے کہ مجھ سے کام لکھوانے چاہتیں تو مجھے یہ سلسلہ جاری رکھنا
چاہیے یا وہاں سے بند کر کے الزجبال صاحب کو (معلوم نہیں اب
وہ کس پرچے کے لیے مکتوب مانگتے ہیں) اپنا کراہی کا مکتوب بھیجنا
چاہیے۔ اتنا مزور ہے کہ یہ کام عباس احمد عباسی صاحب یا الزجبال
صاحب بلا معاوضہ مجھ سے لینے کی توقع نہیں کر سکتے۔ تم کہہ سکتے ہو۔

اور کیا حال ہے جانی۔ اوپر جو لکھا ہے دفتر بے معنی ہے اُسے
عزق سے تاب کرو اور یا شیخ کوئی محبت جبری بات کرو۔ گزشتہ بار
بھرے کی سیر کسی رہی۔ تمہاری شہزادی پری بالو کا کیا حال ہے اور
پاک ٹی افسر تمہارا ایڈریس کب تک رہے گا ۱۱/۱۱/۱۱ اب آؤ

سرویاں بیشک آ رہی ہیں۔ اور تمہارا مزچرم لینے کو جی بیشک
چاہتا ہے لیکن تم تو نسل خاندان کی طرف نہیں بھاگو گے۔ میرا
لاچکر آنے کو جی چاہتا ہے۔ انوس یہ ہے کہ تم سے اب کے
”ملاقات ہی نہیں ہوتی۔ صرف تقارفا ہوا تھا۔“

تمہارا

چکر کا

کراچی ۲۵ اکتوبر

نشا! میری جان۔ تمہارا خط پا کر بے مدغوشی ہوئی۔ تمہارا
 احسانِ بڑا میں ہونا اور پھر اتنی دیر رہنا میرے لیے سوا بن روح تھا
 لیکن چونکہ میں تمہیں کسی متبادلِ ملازمت کا پتہ نہیں بتا سکتا تھا۔
 اس لیے چپ رہتا تھا۔ احمد بیڑ کی بات آدھ رہے۔ وہ تو کامیاب
 زندگی کے لیے ہر طرح کا کیریئر آزمائے گا یہ بات اسے
 بہت ہنسٹی پڑے گی۔ وہ نہ کامیاب بن سکے گا نہ خوش رہ سکے گا۔
 انسان کی آپ دہوا ہی اتنی مسموم ہے کہ وہاں توئی پسند تو درکنار
 کسی بزل اور معتدل مزاج انسان کا گورڈر شکل ہے۔ خیر اچھا ہوا لیکن
 نکلے ہو یا نکالے گئے ہو اگر نکالے گئے ہو تو کس پاداش میں۔ اب
 کیا کرنے کا ارادہ ہے۔ سب چیزیں تفصیل سے لکھو۔

پچھلے کئی دن سے تم پر پیار آ رہا تھا اور تمہارا خط نہ بھی
 آتا تب بھی میں آج تمہیں خط ضرور لکھتا۔ دراصل بات یہ ہے کہ تم
 مجھے سمجھتے ہو اور میں تمہیں سمجھتا ہوں۔ میں تم سے کئی چیزیں لے سکتا
 ہوں اور تم مجھ سے کئی چیزیں لے سکتے ہو۔ لیکن اب تو حالات
 ہی ایسے ہیں کہ کچھائی شکل ہی نظر آتی ہے۔ اول تو یہاں مکان
 ہی میسر نہیں۔ شہر سے کوئی چار میل باہر ایک بیابان میں ایک دوست
 کا مکان ہوں۔ شاید تم اس دوست کو جانتے ہو۔ ان کا نام لوک
 پال سیٹی ہے اور وہ طبری اکاؤنٹس میں ملازم ہیں۔ طبری اکاؤنٹس کے
 غیر شادی شدہ ہمارے ملازمین کے لیے ان کے ٹکے نے ایک ہسپتال
 کی بیک دے رکھی ہے۔ جس میں باقاعدہ ED ہیں۔ شمال کی طرف
 ہمارے بالکل سامنے طبری ہسپتال کی عمارت ہے۔ اور اوپر مغرب میں
 جہاں سے ہو کر بس گزرتی ہے۔ ISERS MEES ہے۔ اس

لفظ ہی سے تمہارے دل میں رومانیت جاگ اٹھی ہوگی، لیکن
 میری جان اس میں فرسین بہت کم نظر آتی ہیں۔ جو دو چار گزرتی
 ہیں ان میں سے کوئی بھی ڈھب کی نہیں ہے۔ سب کی سب صحت
 عسکری کے افغانوں کے کردار ہیں اور پھر تم جانتے ہو۔ اپنا یہ راستہ
 ہی نہیں ہے۔ باقی یہ جگہ جو کچھ شہر سے دور ہے اس لیے تم اسے
 پُر فضا کہتے ہو لیکن پُر فضا ہونے کے لیے سبزے اور رویتدگی کا
 ہونا ضروری ہے اور یہاں سبزے کی جگہ خاک اڑتی ہے۔ محاذوں
 کی خاک نہیں بچ سچ کی۔ بس تیرو یہ ہے کہ صبح آٹھ بجے اٹھتا ہوں
 وہ اس لیے کہ فریجے پانی بند جو جاتا ہے۔ نہانا ضروری ہوتا ہے۔
 دروازہ بند ہے بھی نہ انھوں تو کوئی اٹھانے کا نہیں۔ پھر اس کے
 بعد ہسپتال کی کینٹین پر ناشتہ کر کے پھر بیک میں آ جاتا ہوں۔
 اتنے میں میرے دوست دفن پہنچ جاتے ہیں اور میں پھر پڑھنے لگتا
 ہوں۔ پڑھتے پڑھتے سو جاتا ہوں اور کوئی ایک بجے اٹھ کر شیو
 کرتا ہوں۔ شیو کر کے پھر کینٹین پر چلا جاتا ہوں۔ کینٹین پر روٹی
 تو ملتی نہیں لیکن روٹی ہی واحد چیز نہیں جس میں خدا نیت ہوئی
 ہے۔ ڈبل روٹی ہے۔ کھن ہے۔ انڈے ہیں۔ جام وغیرہ ہیں خود
 لا رکھتا ہوں۔ دودھ بھی مل جاتا ہے۔ سبزے یہ کہ دوپہر کا کھانا کھا
 کر آتا ہوں تو کوئی تین بجے کا وقت ہوتا ہے۔ بس سینٹر پر
 کوئی دس پندرہ منٹ انتظار کرنے پر بس مل جاتی ہے جو مجھے
 صدر پہنچا دیتی ہے۔

صدر کو ابھی کہ بارونق تو رین حصوں میں سے ہے (شاید تم
 کراچی آچکے ہو)۔ یہاں آ کر کرکینے جارہے ہیں چلا جاتا ہوں
 اور ڈیوٹی کے وقت تک (ٹائم تک) وہاں بیٹھا رہتا ہوں چائے

یائین یا اورنج - بہر حال اچھا موٹل ہے۔ جوں سے دفتر کوئی پانچ
دس منٹ کا راستہ ہے چنانچہ وہاں پہنچ کر ایک ڈیڑھ گھنٹہ
کام کرتا ہوں اور پہلی ڈیوٹی ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد
مفتواری دیو بازار کی سیر کرتا ہوں۔ پھر دہلی مسلم ہوسٹل پر کھانا کھاتا
ہوں پھر پارس ہوسٹل میں چائے پیتا ہوں اور پھر بجے دوسری
ڈیوٹی پر چلے جاتا ہوں۔

دوسری ڈیوٹی کو بجے ختم ہوتی ہے۔ اس کے بعد کوئی
حاضری جلدی نہیں ہوتی۔ گھنٹے گھنٹے دفتر کے دوستوں سے
باتیں کرتا پھر صدر جاتا ہوں۔ وہاں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ چائے نوشی
اور گپ بازی میں گزرتا ہے۔ سینا اچھا ہو تو چرنک پاس ہی ہوتا
ہے وہاں چلا جاتا ہوں (کافی سینا دیکھتا ہوں) ورنہ کوئی گیارہ
بجے کے قریب وکٹوریہ روڈ پر ٹھنڈی ٹھنڈی ہو ایں گھر کی راہ
لیتا ہوں۔ یہاں سے گھر کوئی تین چار میل ہے اور راستہ کافی دیرین
سا ہے۔ بس دونوں طرف لمبے لمبے ساحلوں والی اور سفیدے کے
درختوں والی کوٹھیاں ہیں۔ کوئی ٹیلٹ یا مکان نہیں۔ کوئی
دکان نہیں اور اس وقت تو یعنی ساڑھے گیارہ بجے کے قریب
بس کوئی گزرتا آدمی یا کوئی کوئی رکٹ ہوتا ہے جو تھکا ہارا
دھیمی رفتار سے مشرق سے مغرب کو یا مغرب سے مشرق کو نکل جاتا ہے
میری منزل کے ملین درمیان میں فریئر ہال ہے۔ یہ جگہ مجھے کراچی
بھر میں سب سے زیادہ پسند ہے۔ کھلا ماحول ہے۔ آدمی کم ہوتے
ہیں۔ بچے کچھ ہوتے ہیں۔ اور سامنے فریئر ہال کی اینٹوں کی صدی
کی عمارت ہے۔ گر جانا اور تم جانتے ہو مجھے اور تمہیں اسی کچھ اسی
تہذیب اور اسی پڑ اسرار قدامت سے محبت ہے۔ چنانچہ یہاں میں

جی بھر کو بیٹھا ہوں۔ ایک گھنٹہ۔ دو گھنٹے۔ کبھی بارہ بج جاتے ہیں
کبھی ایک اور کبھی دو بجی۔ پھر سب لوگ چلے جاتے ہیں اور میں
بھی ہولے ہولے گھر کی راہ لیتا ہوں۔

فریئر ہال سے گھر کوئی ڈیڑھ میل رہ جاتا ہے۔ راستے میں
صرف ریڈیو لائن اور کراچی ٹھکانوں کا اسٹیشن آتا ہے۔ اس کے
آس پاس بھی ہوسٹل ہیں جو دن رات کھڑے رہتے ہیں۔ اس وقت
وہاں سے بھی بھیڑ بچھٹ چلی ہوتی ہے۔ وہاں ایک پیالی چائے
پیتا ہوں اور ریڈیو کے پچھانک پر پہنچ جاتا ہوں۔ پچھانک بند
ہو یا کھلا۔ وہاں بیٹھا ضروری ہے اور جب تک ایک دو انجن ایک
دو گاڑیاں (دھڑے دھڑا اور دھڑے دھڑا آ جا رہے ہیں طبیعت
نہیں بھرتی۔ یہ کافی زمانہ انجنز اور روٹ پر دور ہوتا ہے۔
ٹرینک ٹوٹا ختم ہو چکا ہوتا ہے اور پچھانک کا چوکیدار بھی میرے
لائن کے باطل قریب بیٹھنے پر معروض نہیں ہوتا۔ مجھے انجنوں
سے محبت ہے۔ خصوصاً کوئٹے والے دیو بیکل بھاری بھر کم انجنوں
سے۔ اب یہ انجن تیل کے انجنوں میں تبدیل کیے جا رہے ہیں ان
کا سائز بھی چھوٹا ہوتا ہے۔ ان سے نہ کھواں نکلتا ہے نہ شرارے
بھڑکتے ہیں نہ رات کو دودھ سے انجن کی بعضی میں لائٹیں ملتی ہوتی
آگ دیکھی جاتی ہے۔ غرضیکہ نہایت UNIMPRESSIVE
چیز ہیں یہ انجن۔ غیر مطلب یہ کہ کوئٹے کے انجن اب بہت تھوڑے
دولر کے مکان ہیں۔ اور ان کا CHARNY جاتا رہے گا۔

ریڈیو لائن سے کوئی ایک میل پر گھر ہے۔ اس ایک میل کو
میں جلدی جلدی ٹکے کر کے اپنی بیک میں پہنچتا ہوں۔ وہاں میرے
بستر کے قریب کا دب رات بھر جلتا رہتا ہے۔ لوگ سو چکے ہوتے ہیں

میں خاموشی سے کچلے آثار کہ بستر میں لیٹ جاتا ہوں۔ سونے سے پہلے کتاب غرور پڑھتا ہوں۔

آدم بگڑو مالی پریشانیوں سے یہاں بھی چھٹکارا نہیں۔ ڈھائی سو میں سے ایک سماجیے پاس رکھ کر ڈیڑھ سو گھر بھجھتا ہوں اور یہاں مضامین سے اوسطاً پچاس ساٹھ روپے اور کمانے پڑتے ہیں۔ تب کہیں گزارہ ہوتا ہے۔ پھر کوئی مذکورہ طرح سامنے رہتا ہے۔ پتلون کی سلاخی۔ بوٹ۔ گرم کوٹ (کپڑا)۔ سلاخی (کیل چارپائی)۔ سائیکل۔ جی ٹیکس وغیرہ وغیرہ۔ یہاں آکر سوٹ بنوایا۔ ایک سو پندرہ خریدی۔ کچھ قیضیں پا چامے بنوائے۔ ازمنہ کافنی خریدا ہو گیا۔ اور تو اور کتابوں کا خرچ کافی ہے (مثلاً اس ایک مہینے میں اٹھارہ روپے)۔ نتیجہ پاؤں ہر وقت چادر سے نکلے رہتے ہیں۔

اور باقی اب تم کہو کیا حال ہے۔ انجین کا کیا حال ہے۔ فقاری تحریروں قصاصے افسانوں اور قصاصے ناولوں کا کیا حال ہے۔ احمدی ای کا کیا حال ہے۔ ملک کا کیا حال ہے۔ مخد کا کیا حال ہے۔ انجین کی کائناتوں میں باہر سے کون کون لوگ آرہے ہیں۔ کائناتوں ہو کہاں رہی ہے۔ احسان میں جرم چل رہی ہے اُس کا تو کچھ کچھ پتہ چتا رہتا ہے۔ باقی ترقی پسندوں کے تعلق و اکثر تاثر اور عبدالسلام خورشید کے مستقل کام بھی پڑھتا رہتا ہوں۔ نظام میں (غالباً) عبدالملک کی طرف سے تاثر کا فقدان ممکن جواب بھی پڑھا ہے۔

میں نے یہاں آکر چند متفرق مضامین لکھے ہیں بعد میں وہ سب امر میں بھیجے، کیونکہ آخر دہم روح و فن تو برقرار رکھنا ہے۔ ان میں بعض اتنے اچھے ہیں کہیں امر و مذکبجائے سویرا میں چھپوانے میرے نزدیک پیرسب سے بڑی ضرورت۔

سویرے روزمرہ کی زندگی۔ ہفتے کو چھٹی ہوتی ہے جتنے کی شام کافی باؤس میں گزارتا ہوں۔ انوار کی صبح منورہ جاتا ہوں کشتیوں کی سیرا بھی رہتی ہے، دراصل کراچی خاص سے منورہ جانے کیلئے کشتیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ لالچ بھی مل جاتی ہے یعنی انجن والی کشتی، لیکن مجھے بادبانی کشتی پسند ہے۔ دیر سے تو پہنچاتی ہے لیکن وہ کشتی کیا جس میں بادبان نہیں۔ طالع نہیں۔ ڈوبنے کا خطرہ نہیں۔۔۔۔۔

سویرے بھاتی یہ ہے آج کل کی زندگی اور مجھے اس زندگی سے کوئی شکوہ نہیں۔ دیرانے کا واقعہ ہوا ہوں۔ آبادی سے یوں بھی گھبراتا ہوں۔ میرے لیے تو یہی کراچی ہے۔ میرے خیال میں یہ سب پھیریں قبیل و کش اور جاذب نظر آئیں گی۔ اگر ایسا ہے تو مجھے کوئی تعجب نہ ہو گا۔

ادب کی مسطوریں دفتر میں تباہا خط ملنے پر کبھی جھٹکی جلدی سے چند مسطور اپنی برک سے گھڑ رہا ہوں۔ موز میں نرین آسمان کا فرق ہے۔ چنانچہ باتیں بھی اسی طرح کی کروں گا۔ سرودیاں شروع ہو چکی ہیں اور رات کو کافی سرودی رہتی ہے۔ یہاں کونٹے سے سرودی کی لہر آیا کرتی ہے اور تم اخبار پڑھتے ہو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ کونٹے میں آج کل درج حرارت ۱۹ ڈگری تک پہنچ جاتا ہے یعنی درجہ انجماد سے بھی ۱۳ درجے نیچے۔ خیر مرچ آئید بر سر اولاد

نہیں رہا ہے۔ اور سویرا نے مجھ سے جو سلوک کیا ہے وہ کافی شرمناک ہے۔ مضمون کے لیے مجھ سے -/۲۵ روپے کا وعدہ کیا گیا اور مجھ پر زور دے کر مضمون اس طرح لکھوایا گیا کہ لاہور سے کراچی آنے کی آخری درمیانی شب بیٹھا امروز کے دفتر میں لکھتا رہا۔ تب کہیں اسٹیشن پر گیا۔ چودھری صاحب اور حاجی صاحب نے تو مضمون ان کے حوالے کرنے کے قابل ہو ا۔ اس وقت چودھری صاحب کو یاد آیا کہ وہ روپے اپنے ساتھ نہیں لائے لیکن اس میں کوئی مہرج نہیں۔ چنانچہ انہوں نے یہاں کے ایک کتب فروش کے نام چپٹ لکھ دی کہ ابن الف صاحب میرے عزیز دوست ہے انہیں بیس روپے میرے حساب میں سے دے دیجیے۔ میں نے -/۲۵ کی جی تے ۲۰/۰ کو دینے پر احتجاج کیا تو انہوں نے کہا صرف اب کے لیے جاؤ حالات - فسادات

غیر یہاں ایک کتب فروش کے ہاں گیا۔ اس نے کہا کہ نذیر صاحب ہم سے سب کچھ وصول کر چکے ہیں۔ ان کا اب ہمارے ساتھ کوئی حساب نہیں۔ چنانچہ میں خود بھی طرصار ہوا اور ان کو بھی شہر آکیا۔

اس پر ایک لفظ فراہی صاحب کو لکھا۔ جواب نثارو

یا ودیائی کے لیے ایک کارڈ لکھا۔ جواب نثارو

شرح دلانے کے لیے ایک خط لکھا۔ جواب باسکی نثارو

گلد جھانے دفا کھرم کو اہل حرم سے ہے

کسی ہنگامے میں دیاں کروں تو کچھ ہم بھی ہی ہوں

۱۰۔ اکتوبر کا لکھا خط آج ۱۱ نومبر کو پوسٹ کر دیا ہوں۔

تہسارا

چڑکا

۲۳ جون ۱۹۷۱ء

ارے ننگے میری جان

تھکے سے یادوں کے گلاب سب کے سب میں نے پٹھے ہیں بلکہ سوئٹے ہیں اور پرانے دفن کی یاد پر دل کو کچھ کچھ ہوتا بھی رہا ہے بعض جگہ تم سے ابھرتے بھول ہوتی ہے کیونکہ دردنا گورا حافظ نیا خود۔ بعض جگہ تمہیں ٹوکنے کو جی چاہا لیکن نظری کا ل کی وجہ سے نہ ٹوکن سکا۔ عزیزوں پر خوشبو کے پان والا کیا تھا ہے۔ ارے میں لڑتے ہو کاپان کھانے والے کے پاس سے بھی نہیں گزر سکتا۔ اس گپ میں کیا سانس ہے۔ کچھ تو عقل سے کام لیا کرو۔

وہ انگریزی کا ہنر وار پرچہ جس کی تم سرسیتی کرتے تھے ہند ہو گیا یا ابھی تک نکل رہا ہے۔ اس کا ذکر میں نے تمہارے ہاں نہیں دیکھا۔ عشق و عاشقی لوکیوں کے تذکرے میں بھی تم ڈنڈی ملکہ ڈنڈا مارتے ہو۔ دیکھا کہ تمہاری موموٹھنی شکل اور موموٹھنی تحریر کے چکر میں آجاتی ہیں اور تم اپنا جی تل کر لائیے ہو جاتے ہو۔

خیر میاں تم تو تمہارے عاشق ہیں۔ فی زمانہ اور کوئی میں لینے پر عاشق ہونے کی اجازت بھی نہیں دیتا۔ اب کے سڈے میں جو تصویر تم نے چھپائی ہے جس میں میں تم اشتاق اور میر نازی کھڑے ہیں یہ مجھے چاہیے۔ بیچ دو۔ کوئی کو داکے واپس کروں گا۔ ارے میں تمہاری طرح جھوٹا اور ناقابل اعتبار آدمی نہیں ہوں عذر واپس کروں گا۔ میری کتابیں جو تم جی تے گئے ہو وہ میں نے صاف کیں بلکہ بھول گیا کچھ۔ میرا بھی تو حافظ فراہ ہے۔

اب کے لاہور آیا تو ملوں گا۔ اور جی کڑا کر کے تمہارا مزہ

چوم لوں گا اور شہر میں گھومیں گے۔ لاہور کی گلیوں میں چٹک تو

نہیں پڑھتے۔ اس میں ہمارے قلم سے جرد ادب عالیہ سرزد ہوتا ہے
اس سے غلام بہتے ہو۔ تمہاری قسمت۔ اچھا اب میری دو کتابیں
آگری ہیں۔ ایک جدید اردو ریڈر۔ اردو کی آخری کتاب کے نام
سے۔ دوسری مقررنامہ "آوارہ گرد کی ڈائری" ان کے بارے میں کچھ
لکھنے کو تیار رہو۔ حرام غری مت کرنا۔

خط لکھو۔ فردا

تمہارا
انشاء

۱۵ جون

مے (پیارے) حمید

میں نے تمہارے کارڈ کے بعد دو تین دن مضمون کا انتظار کیا
جب وہ نہ آیا تو میں سمجھا کہ تم صاحب مانت حوائیڈن کر رہے ہو، چنانچہ
کل بل کر ایک پوسٹ کارڈ لکھا جو تمہاری طبیعت کو خوش اور تمہارے
شام جان کو مطمئن کر چکا ہو گا۔ آج تمہارا رجسٹری لفافہ مضمون بھی پڑھا
اور وہ دہی بھی جو احقر بیارے کے قلم سے لکھی ہے۔ میرے لیے اس
دہی کی قدر و قیمت زیادہ ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مضمون اس
سے گھٹیا ہے۔ تمہارے اس خط میں اے قید کی شخصیت متاثر زیادہ ہے۔
مضمون میں نے پڑھ لیا اور اس کے لیے تمہارا بہت ممنون ہوں
لیکن میں نے دیکھا ہے کہ اس پر کاتب صاحب نے اپنے مخصوص نشانات
بناد گئے ہیں۔ کم از کم ایک بار ضرور کاتب اسے کھچکا ہے۔ کس کے لیے؟
دوسری بات یہ کہ اس پرچے میں جڑے ہی کا کاج کے ٹکڑوں ٹکڑوں کے لیے
تمہارا اس قسم کا مضمون چھپنا تمہارے حق میں زیادہ اچھا نہ ہو گا۔ لوگوں
کو آزاد صاحب سے زیادہ تم سے دلچسپی ہے۔ تمہیں اپنا کوئی انسان
دینا چاہیے تمہارا مزاجیہ مضمون چاہیے وہ نسبتاً چھوٹا ہی ہوتا۔ اب ہر حال
یہ مضمون تو میں نے تابو میں کر ہی لیا ہے۔ تم نے اسے مختصر کرنے
کی ہدایت بھی کر دی ہے میں یوں بھی کسی کے مضمون کو قلم نہیں لگایا
کرتا۔ اب بھی وقت ہے کہ انسان یا مضمون دے دو۔ یہ باتیں دوستی
میں کہہ دیں اگر کسی پہلے کارکی ایڈیٹر ہوتا مگر نہ کہتا ورنہ آئندہ
مضمون لکھنے کی امید منقطع ہو جاتی۔ میری ایڈیٹری بھی تو اس شمارے کے
ساتھ ختم ہو جائے گی۔ تمہارے امتحان کا کیا ہوا۔ میرا بھی نتیجہ جولائی
کے آخر میں آئے گا۔ آج کل میں کچھ نثر لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

ایک کمالہ ساقی کے خلاف فریب میں دیکھو گے۔ ایک اور کمالہ ساقی کے اب تک نہ نکلنے کے متعلق ہے اس میں تمہارا بھی ذکر ہے اپنی اس زندگی کا بھی جب ہم کتابت کیا کرتے تھے اور تذکرہ قیام میں ملتا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہیں چھپو آؤں۔ دیکھو۔ ورنہ تمہیں ویسے چھوٹا۔ جان میں ذرا تفصیل سے لکھو۔ کیا کر رہے ہو اور کیا نہیں کر رہے ہو۔ گراچی کب آ رہے ہو۔ اور دیکھنا انتظار کا ایڈریس میں بول گیا۔ اس نے مجھے کچھ بھیسنے کا وعدہ کیا تھا۔ یاد دلانا۔ مجھے سب سے زیادہ انتظار تمہارے خط کا رہتا ہے مجھے بگا ہے اپنے دل کا عیار نکال لیا کرو۔ ساتھ ہی میرا بھی نکل جایا کرے گا۔

ابن اثنا

سربراہ لاہور کے قریبی لاہور

دلی ڈیرہ اسے عید

تم مری کی پہاڑیوں کی چوٹیوں پر ایسے جڑھ کے بیٹھ گئے ہو کہ ہم خاک نشینوں کی خبر ہی نہیں دیتے۔ بس بہت میر ہو چکی۔ اب آ جاؤ۔ قرار خاطر ہے تاب ٹھک گیا ہوں میں ہاں ٹھیک ہے۔ تمہارا خط ملا۔ لیکن خط سے کیا ہوتا ہے۔ قیام اب ایک ہفتہ نہیں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ مثلاً آج میری نظم ہے بغداد والی۔ جسے پڑھنے کا وعدہ تم نے کیا تھا۔ اور کل انجمن ترقی پسند مصنفین پر تم میں عادی ہے۔ کیا یہ دن بہار کے تمہارے بیز ہی گزریں گے۔

اور پھر افادہ۔ اب تو سربراہ کی آخری مراصل میں ہے چھپائی لکھی کے۔ افسانے کے پنے طوالت کے لحاظ سے جگہ بھی تو موزوں۔ لیکن مجھ کو صاحب کہتے ہیں تمہارا خط آ گیا ہے اور تم نے افسانہ پڑھ

کر دیا ہے اور تم ہفتہ نہیں آ رہے ہو۔ پس بہت معلوم ہوتا ہے کہ میں بھی اس سلسلے کے پڑھاک ڈالوں اور کہوں۔ لو ایک ہفتہ سنو۔ لیکن ہفتہ سنانے سے پہلے مجھے یہ خط ضرور پوسٹ کرنے دو۔

ابن اثنا

۲۵ مئی

جان میں

تمہارا حقیر سا ڈھائی سطری خط مل گیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تمہارے امتحان ابھی اور بھی باقی ہیں۔ محنت اور آدمی ہو رہا ہے تم سکاڑھی ہو۔ عبدالحمید ادیب فاضل "بھٹنہ کی کوشش" ذکر و ذکر کی لے کر میں نے یا کسی اور نے کیا فیض پایا جو تم پاؤ گے۔ تمہارا ہتھیار تمہارا قلم ہے۔ خیر اب یہ امتحان دے ہی چکو۔ سند ہے آفاق ہند ہونے کی وجہ سے تمہیں ال پریشانیوں بھی دیں۔ اب یہ معاملہ ٹھیک ٹھاک ہو گیا ہے۔ مارشل رائے لاہور کی یعنی لاہور کے کوچہ گرد آوارگی و شہر گدگی پسند۔ تعلق نواز۔ جیسے نور۔ عاشق مزاج آزادہ ندوں کی زندگی کو چھوڑا ہوا کیا ہے اس پر کچھ لکھو۔ پیارے وہ لاہور لاہور ہی تھا۔ لاہور صاف سڑکوں اور سستے دودھ دہی کا نام نہیں۔ بڑے ہی گندی گلیوں اور اوندھ گھٹتے ہوئے انجیروں کا نام ہے۔ اس کے متعلق کچھ لکھو۔ انتظار کا خط آیا تھا اسے اس شہر کی تباہی کا بڑا علم ہے۔ تم تو لاہور کو اس سے زیادہ جانتے ہو۔ تمہارا تو اس پر داخل بھی ٹھکتا ہے۔ میرا پرچہ محض تمہاری وجہ سے رکا ہوا ہے۔ اب بہت وقت نہیں۔ ایک ہفتے میں چھپ بھیج دو۔ ہماری عاشقی اور اپنی مشق کی شرم ہی کر دو پیارے شکا۔

تمہارا

ابن اثنا

حمید کے بچے۔ آخر پریشان کرنے سے فائدہ اور اوپر پر تصویر
اپنے..... کی بنائی ہے ؟ تعاملاً وہ کنوارے معنوں کہاں گیا کہہ سیں
دستے میں کسی شادی کے خواہش مند کے بچے نہ چڑ گیا جو۔ بہر حال
بلک گل کو رشتہ اب ملک مطلوب ہے۔ فرما۔ فرما۔

ابن النشا

۴۴ اگست

اسے حمید! ایسے فن ہے تجھ پر۔

اب سنو۔ یہ جو سرکاری پرچہ ہے نا، پاکستان کو اب دہلی کو آج کل
اس کی ایڈیٹر قرة العین حمید رہیں۔ میں نے ان کو فون کیا تھا کہ آپ
اردو کی کہانیاں ترجمہ کرا کے کیوں نہیں چھاپتیں۔ انہوں نے کہا۔ تم
آج ہی کہانی منتخب کرو اور ترجمہ کرا دو۔ اس پرچے میں چلی جانے
گی۔ میں نے رات کو ادب لطیف نکال کر قصاری کہانی، مات کا
درخ کو اس نظر سے دیکھا۔ وہ بڑے کمال کی چیز ہے۔ اس میں
قصاری بھی خوبیاں بھر پور ملتی ہیں۔ سرکاری پرچہ ہونے کی وجہ
سے اس کے بعض حصے حذف کرنے لائق تھے۔ مگر وہاں اختصار بھی
ملاحظہ تھا۔ لہذا وہ ایڈنگ مجھے کرنی پڑی۔ اس پرچے کا انٹرنیشنل
سرکولیشن ہے اور اس سے پہلے اس میں کچھ بہترین اردو بلکہ کہانیاں
کے ترجمے چھپ بھی چکے ہیں اس لیے میں چاہتا ہوں کہ قصاری کہانی۔
جو قصاصہ راج کی فائدہ جو ضرور آئے۔ بہر حال کہانی میں نے مزید

کو بھجوا دی اور انہوں نے بھی بہت پسند کی۔ اب وہ ترجمہ کے حوالے
کر دی گئی ہے۔

تم آدمی گھنٹا جو اس لیے احتیاطاً قبیلں لکھ دیا تا کہ ایسا نہ ہو
کل اس کہانی کو دیکھ کر شکایت کرو کہ
کالی جی کبوتر کھا گئی رہے

اس میں سے کوئی کبوتر نہیں کھا یا گیا۔ بعض دیر سے بعض ایسے پرے
خوف کئے گئے ہیں جن سے کہانی کی اچھائی میں خلل نہیں آتا۔ خصوصاً بنر علی
قارین کے نقطہ نظر سے۔ تم جیسے جو یا مر گئے۔ جو کچھ معلوم نہیں۔

چڑکا

پیارے شکشا!

میں نے تمہیں دو خط لکھے اور تم نے کوئی جواب نہ دیا۔ تمہاری
لکھی اپنی جگہ مسلم لیکن بھائی آدمی دیکھ کے بات کیا کرتے ہیں۔
لاہور کے ترقی پسند دوستوں نے مجھے ایسے اصول اور موقع پرست اور
رجسٹر پسند کہہ کر چھوڑ دیا آخر تم نے بروخو ایسے اصول "سورج پرست"
اور رجسٹر پسند ہو مجھے کس لیے چھوڑا ہے۔

بس اتنا ہی کہنا تھا اور آخری بار کہنا تھا۔ اور وہ مضمون جو میں
نے بھیجا تھا ابھی چھپا کیوں نہیں؟ سیدھی طرح کیوں نہیں بتاتے۔
بس اب بیک بک ست کرو۔ خط لکھو۔

تمہارا

چٹرا

اکھلا کر کراچی

۲۲ ستمبر ۱۹۵۴ء

پیارے!

شکایت کے لیے اتنا لا نہیں سکتے۔ اگر تم اشنا یا مضمون نہیں
بجھو گے تو تمہارا وہ خط چھاپنے کو دے دوں گا۔ اس میں جو
گولیاں ہیں وہ بھی نہیں کاڈں گا۔ تمہاری تمہیں کھل جائے گی۔
پلس - جان بن:

تمہارا

چٹرا

کراچی

۲۴ اکتوبر ۱۹۶۹ء

پیارے اے حمید!

معلوم ہوتا ہے تم ابن انشا کے ہاتھ سے گئے۔ وہ ابن انشا جو
تمہارے دل کے اتنا قریب تھا جس کے ساتھ لائسنس باغ اور لہذا
کی سرپرستی ہوتی تھیں۔ جس نے تم سے بہت کہہ لیا تھیں بہت کہہ دیا۔
جان بن اگر یہ کیا نہیں تو تم خط کیوں نہیں لکھتے۔

تمہیں معلوم ہے یہاں مجھے تمہارے حقوق کا لحاظ تھا۔ اس لیے
سمجھا جاتا ہے۔ تمہاری تعریف اور تمہاری برائیوں کے سلسلے میں مجھے
مخاطب کیا جاتا ہے۔ اور تعجب کیا جاتا ہے لیکن پھر میں وہی سوال
پوچھوں گا کہ تم مجھے خط کیوں نہیں لکھتے۔

تم سے دوسرا ری کام ہیں۔ ایک قریہ کہ پاک سرزمین کے لیے
کوئی مزاحیہ ماحضون لکھ دو۔ تمہارا وہ مضمون سب نے پسند کیا۔
کس بارش کا حال۔ کسی گلوں کی لاری کے سڑکا حال۔ کس چچا سانس
کا احوال۔ بیجو بیجو فوراً بیجو۔ دوسرا پرچہ تمہیں اکتوبر کے پہلے ہفتے
میں مل جائے گا۔

دوسری مزدوری بات یہ ہے کہ تخلیق کے ساتھ اپنا وعدہ پورا کرو۔
ابناں تم نے کوئی نئی چیز نہ کی ہو گی۔ وہ دوست ہیں لہذا ان کو درپیش
ہونے کے لیے ضرور کچھ دینا۔ تمہاری اور میری پریسنگ کا تعاون ہے۔

میں تیسری بار پوچھتا ہوں کہ تم مجھے خط کیوں نہیں لکھتے۔ حفوظ
کو سلام۔ وہ کیس ہے۔

تمہارا

ابن انشا

۱۹ نومبر ۱۹۹۹ء

مزدیہ تیز۔ برقرار دار غباشت آثار مجھے رہو۔ یہ تم نے
 بڑی سعادتمندی کی کہ ہماری علالت پر فکر مندی کا اظہار کیا۔ کیونکہ
 اس میں کچھ نہیں گتا۔ ہلے سے کچھ نہیں جاتا۔ اب تمہارے لکھنے
 کے بعد مجھے اپنی صحت کی فکر پڑ گئی ہے۔ رہتا رہا خط آنے سے پہلے
 مجھے اپنی علالت کا احساس بلکہ پتہ بھی نہ تھا۔ صحت کا مدد کے لیے
 اپنی دعا براہ راست اللہ میاں کو بھیجو۔ مجھے کوئی ڈاک خانہ بھروسہ
 ہے۔ ہاں میرے گھر میں تکلیف ہے سوہنے والوں کی وجہ سے ہے
 میں رات کو بھر رہا ہوں اور میاں کی ٹوٹی کا ریاض کرنا چاہتا ہوں۔
 یہ لوگ موسیقی کا ذوق کم رکھتے ہیں اور ان کے اعتراضات مانع کرنے
 کے انداز بھی شائستہ نہیں۔ پس اپنے شوق موسیقی کو مسلسل ضبط
 کرنے کی وجہ سے گھر کی دہلیزیں اسی طرح بھول جاتی ہیں۔ جس طرح
 کسی افندہ نگار یا شاعر کی تخلیق آپ دہلیزوں سے گزرتی ہے۔ جو جانا
 ہے۔ میں بعض لوگوں سے ملنے بھی کرتا ہوں کہ میں ڈیڑھ گھنٹہ رہتا ہوں۔
 لیکن جو لوگ کن ریا نہیں ان کو پختہ قانون کے رموز و اقوات اور
 نیک کے حلالوں کے درمیان فرق کیا معلوم ہے؟

تم نے شراب چھوڑ دی؟ کس سے بچھوڑ کے چھوڑی۔ ہمیشہ
 جہیز و داماد حرکتیں کرتے ہو۔ عواجب پر نظر نہیں رکھتے بے شک
 شراب پینا بڑی بات ہے لیکن اسی صورت میں جب کہ اپنے پنے
 سے ہلی جاتے۔ مجھے بحیثیت صحافی کے بھی تمہارا شراب چھوڑنا پسند
 نہیں آیا۔ اب منوجانی کو شکایتی خط لکھوں گا۔ اس کا مطلب یہ
 ہے کہ وہ اخبار بھی بند ہو گیا ہو گا جس میں تم شیکلے سے جوش خرم
 کو لینا کرتے تھے۔ بہت سے صحافی بہ روزگار ہو جائیں گے۔ کیونکہ وہ

لوگ تو اخبار نکالتے اور بچھپاتے ہی قہاری ضرورت کے لیے نکلے کیونکہ
 چھپ کر پینا مشرقی میاں کا تھا نہ ہے۔ جس طرح کسی کے منہ پر بھی
 اور دلازاری کی بات نہ کرنا اور فقہانہ جیسے اس کے بارے میں
 اعلیٰ کلام الحق ہمارے مشرقی اخلاق کا لازمہ ہے۔

تھوڑا سا میں یہ ہے کہ مجھے آرام کی ضرورت ہے۔ روزانہ مسلسل
 کئی کئی گھنٹے کام نہ کرنے کی وجہ سے تھکن جو رہی جاتی ہے۔ بعض اوقات
 تو بینوں پر کوری میں معروف رہنے کی وجہ سے سرگھمانے کی فرصت
 نہیں ملتی۔ اب میں باہر جانے والا ہوں کیونکہ اس ملک کی آب و ہوا
 مجھے راس نہیں آتی۔ پتہ نہیں تم ایسی لوگ کیسے یہاں رہتے ہو۔

تم بے ہوش رہتے ہو۔ لیکن تم کو جہائیں گھرنا ہوا فرض ہے۔ اور کوئی
 بدعات نہ چھوڑنا۔ دوسرے جنگ کراچی میں میرا کالم بالائزمام پڑھا
 کرو۔ آج بھی چھپا ہے۔ اگلے ہی چھپے گا اور پھر چھپتا ہی رہے گا کیونکہ
 یہ خاص چیزیں ہیں جو میں نے ڈیکو سے بھیجیں تھیں۔ تاہم یہ ان اخباروں
 پر ہے۔ اور ۹ دسمبر کی ہوگی۔ رکھنا اور تمہارا اولاد کے لیے پیار۔
 تم نے میری کتاب نہیں پڑھی صرف نیچے والی نظم پڑھی؟

تمہارا

ابن انشا

ابن انشا بنام اسے حمید

کراچی

۳۰ جون ۱۹۵۶ء

دیارے!

اس دن کے بعد تم سے ملاقات نہ ہوئی۔ اس میں میری عسوفیت اور غم کا بہت تصور ہے لیکن تمہاری ہماری محبت کوئی ملاقاتوں کی محتاج نہ ہوئی ہے۔ تخلیق کے دیگر خواہ صاحب میرے دوست ہیں تم تو اس سے بڑھ کر بھی تھے پھر اچھا لگا لیں گے۔ فوراً ان کو کہانی دو۔ ۷۷۷ پیج بھیجے تم نے کہانی زدی تو میں تمہارے پیسے جو مجھے اپنے پرے کی طرف سے نہیں دیتے میں دیا جاؤنگا۔

حقیقت کو سلام۔ اس کی محنت اچھی ہے۔ سچ جانو تم سے دوبارہ نہ ملنے اور حقیقت کی دعوت نہ کھانے کا دل ملال ہے۔

مقصود کا پتر مجھے بھیج دو کہ ان کے ڈیرے میں بنانے کا کیا لیتا ہے۔

مجھے اس کو چینی نظموں کے بارے میں خط لکھنا ہے۔ تمہارا

ابن انشا

کراچی

۲۵ اکتوبر

مٹکا! میری جان۔ تمہارا خط پاکر بے حد خوشی ہوئی۔ تمہارا احسان میں ہونا اور پھر اتنی دیر رہنا میرے لئے سو جان روح خدا کیونچہ کہ میں تمہیں کسی متبادل ملازمت کا پتر نہیں دے سکتا تھا اسی لئے چپ رہتا تھا۔ احمد علی کی بات اور ہے۔ وہ تو کامیاب زندگی کے لئے ہر طرح کا کیریئر

آزمائے کوتاہی سے گریز بات اسے بہت مشکل پڑے گی۔ وہ نہ کامیاب ہیں سکے گا نہ خوش رہ سکے گا۔ احسان کی کہہ دیا ہوا ہی اتنی مسکوم ہے کہ وہاں ترقی پسند تو درکنار کسی لبرل اور معتدل مزاج انسان کا گزر مشکل ہے۔ خیر اچھا ہوا۔ لیکن نکلے ہوئے نکلے گئے ہو۔ اگر نکالے گئے ہو تو کس پاداش میں اب کیا کرنے کا ارادہ ہے۔ سب چیزیں تفصیل سے لکھو۔

پچھلے کئی دن سے تم پر پیار کا افسانہ اور تمہارا خط نہ نہیں آتا تب بھی میں آج تمہیں خط ضرور لکھتا۔ دراصل بات یہ ہے کہ تم مجھے سمجھتے ہو اہل میں نہیں سمجھتا ہوں۔ میں تم سے کئی چیزیں لے لے رہا ہوں اور تم مجھ سے کئی چیزیں سیکھ سکتے ہو۔ لیکن اب تو حالات ہی ایسے ہیں کہ یکسانی مشکل ہی نظر آتی ہے۔ اول تو یہاں مکان ہی شہر نہیں۔ شہر سے کوئی چار میل باہر ایک بیابان میں ایک دوست کا مہمان ہوں۔ شاید تم اس دوست کو جانتے ہو ان کا نام وک پل سیشی ہے اور وہ ملٹری اکاؤنٹس میں ملازم ہیں۔ ملٹری اکاؤنٹس کے غیر شاہی شہر مہاجر ملازمین کے لئے ان کے منگنے کے ایک ہسپتال کی بیک کمرے رکھی ہے۔ جس میں باقاعدہ BED ہیں۔ شمال کی طرف ہمارے بالکل سامنے ملٹری ہسپتال کی عمارت ہے اور دوسرے مغرب میں جہاں سے ہو کر بس گزرتی ہے۔ SISTERS MESS ہے۔ اس لفظ ہی سے تمہارے دل میں رومانیت جاگ اٹھی ہوگی۔ لیکن میری جان اس میں میں نہیں سمجھتا کہ نظر آتی ہیں جو دو چار گزرتی ہیں ان میں سے کوئی بھی ڈھب کی نہیں ہے۔ سب کی سب حسن عسکری کے افسانوں کا کردار ہیں۔ اور پھر تم جانتے ہو۔ اپنا یہ راستہ ہی نہیں ہے۔ باقی یہ جگہ کلر شہر سے دور ہے اس لئے تم اسے نہ فضا کہہ سکتے تو لیکن پھر فضا ہونے کے لئے سبزے اور روئیدگی کا ہونا ضروری ہے اور یہاں سبزے کی جگہ خاک اڑتی ہے۔

گزرتا ہے۔ سینا اچھا ہو تو چوکر پاس ہی رہتا ہے وہاں چلا جاتا ہوں۔
 (کافی بیٹھا دیکھتا ہوں) اور نہ کوئی گیارہ بجے کے قریب دکھایا رہا پر شعلہ
 شعلہ کی پراساں پودے گھر کی راہ لیتا ہوں۔ یہاں سے گھر کوئی تین چار میل
 ہے اور راستہ کافی ویران سا ہے۔ بیس دو ٹولہ لیے لیے اعطوں والی اور
 سفیدے کے درختوں والی کوٹھیاں ہیں۔ کوئی غلیظ یا مکان نہیں۔ کوئی
 دکان نہیں۔ اور اس وقت تو بیس ساڑھے گیارہ بجے کے قریب میں کوئی گرتی کوئی
 یا کوئی کوئی رکشا ہوتا ہے جو تھکا ہارا جیسی رفتار سے مشرق سے مغرب کو
 یا مغرب سے مشرق کو نکل جاتا ہے۔ میری منزل کے عین درمیان میں فریئر ہال
 ہے۔ یہ جگہ مجھے کراچی بھر میں سب سے زیادہ پسند ہے۔ کھلا ماحول ہے
 آدمی کم ہوتے ہیں۔ بیچ بچے ہوتے ہیں۔ اور سامنے فریئر ہال کی ایسویں درجہ
 کی عمارت ہے۔ گرجا بنا۔ اور تم جانتے ہو مجھے اور تمہیں اسی کچھرازی نزدیک
 اور اس کے روبرو راحت سے محبت ہے۔ چنانچہ یہاں میں جی بھر کر بیٹھتا
 ہوں۔ ایک گھنٹہ۔ دو گھنٹہ کبھی بارہ بج جاتے ہیں کبھی ایک اور کبھی دو
 بجے۔ پھر سب لوگ چلے جاتے ہیں اور میں بھی بولے بولے گھر کی راہ
 لیتا ہوں۔

فریئر ہال سے گھر کوئی ڈیڑھ میل رہ جاتا ہے۔ راستے میں موت
 رہوے لائن اور کراچی چھاؤنی کا اسٹیشن آتا ہے۔ اس کے آس پاس بھی
 ہوٹل ہیں جو دن رات کھلے رہتے ہیں۔ اس وقت وہاں سے بھی بیڑ چٹ
 چکی ہوتی ہے۔ وہاں ایک پیل چائے دیتا ہوں۔ اور بیوے کے سپلاں پر
 پہنچ جاتا ہوں۔ یہاں تک بند ہو یا کھلا۔ وہاں بیٹھنا ضروری ہے۔ اور جب
 تک ایک دو انجن ایک دو گاڑیاں اور دوسرے دوسرے دوسرے دوسرے
 جاؤں طبیعت نہیں بھرتی۔ یہ کوئی زمانہ انگیز اور روح پرور ماحول
 ہوتا ہے۔ ٹریک عموماً ختم ہو چکا ہوتا ہے اور یہاں تک کا پکیرا بھی میرے

مخاورے کی خاک نہیں۔ سچ لکھی۔ بس نتیجہ یہ ہے کہ صبح آٹھ
 بجے اٹھتا ہوں۔ وہ اس لئے کہ نو بجے پانی بند ہو جاتا ہے۔ نہانا
 ضروری ہوتا ہے۔ درخت بارہ بجے بھی نہ اٹھوں تو کوئی اٹھائے گا
 نہیں۔ خیر اس کے بعد ہسپتال کی کینٹین پر ناشتہ کر کے پھر بیڑ
 میں آ جاتا ہوں۔ اتنے ہیں میرے دوست و فتر چلے جاتے ہیں اور میں
 پھر بیڑ چلنے لگتا ہوں۔ بیڑ چلتے چلتے سو جاتا ہوں اور کوئی ایک بجے
 اٹھ کر شیو کرتا ہوں۔ شیو کر کے پھر کینٹین پر چلا جاتا ہوں۔ کینٹین پر روٹی
 تو ملتی نہیں لیکن روٹی ہی واحد چیز نہیں جس میں غذائیت ہوتی ہے
 ڈبل روٹی ہے۔ مکھن ہے۔ اٹھتے ہیں۔ جام و نیو میں غولہ رکھتا ہوں
 دودھ بھی مل جاتا ہے۔ غرضیکہ دوپہر کا کھانا کھا کر اٹھتا ہوں تو
 کوئی تین بجے کا وقت ہوتا ہے۔ بیس ٹیٹھ پر کوئی دس پندرہ
 منٹ انتظار کرنے پر بس مل جاتی ہے جو مجھے صدر پہنچا دیتا ہے۔
 صدر کراچی کے بارون ترین حصوں میں سے ہے۔ (غرضیکہ)
 تم کراچی آچکے ہو۔ یہاں آکر کیسے جا رہے ہیں چلا جاتا ہوں اور
 ڈیوٹی کے وقت تک (ایک سو تک) وہاں بیٹھا رہتا ہوں۔ چائے پائیں
 یا اور کچھ۔ بہر حال اچھا ہوٹل ہے۔ وہاں سے دفتر کوئی پانچ دس منٹ
 کا راستہ ہے چنانچہ وہاں پہنچ کر ایک ڈیڑھ گھنٹہ کام کرتا ہوں اور پہلی
 ڈیوٹی ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد حضور دیوبند کی سیر کرتا ہوں۔
 پھر وہی مسلم ہوٹل پر کھانا کھاتا ہوں۔ پھر پارس ہوٹل میں چائے
 پیتا ہوں اور پھر کچھ دوسری ڈیوٹی پر آ جاتا ہوں۔

دوسری ڈیوٹی تو جیسے ختم ہوتی۔ اس کے بعد کوئی خاص جلدی
 نہیں ہوتی۔ شعلہ سے شعلہ سے دفتر کے دوستوں سے باتیں کرتا پھر
 صدر جاتا ہوں۔ وہاں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ چائے نوشی اور کپ بازی میں

لائن کے بالکل قریب کے جھنگ پر بیٹھے پرستش نہیں ہوتا۔ مجھے انہیں سے محبت ہے خصوصاً کونے والے دو بیکل ہماری بھرمک انہوں سے۔ اب یہ انہیں تیل کے انہوں میں تبدیل کئے جا رہے ہیں۔ ان کا ساتھ بھی چٹا ہوتا ہے۔ ان سے نہ دھواں نکلتا ہے نہ شکرے بجھتے ہیں نہ رات کو دودھ سے انہیں کی بجائے میں لائیں مائی ہونگے ان کو مائی دیتی ہے۔ غرضیکہ نہایت UNIMPRESSIVE چیز ہیں یہ انہیں۔ خیر طلب یہ کہ کونسل کے انہیں اب بہت تھوڑے دنوں کے مہمان ہیں۔ اور ان کا CHARM جاتا رہے گا۔

ریلوے لائن سے کوئی ایک میل پر گھر ہے۔ اس ایک میل کو میں جلدی جلدی طے کر کے اپنی بیک میں پہنچ جاتا ہوں۔ وہاں میرے بستر کے قریب کا بلب رات بھر جلتا رہتا ہے۔ لوگ سوچتے ہوتے ہیں۔ میں خاموشی سے کپڑے اتار کر بستر میں دیک جاتا ہوں۔ سوئے سے پہلے کتاب منور پڑھتا ہوں۔ عادت بن چکی ہے۔

سو یہ ہے روزمرہ کی زندگی۔ مجھے کچھ شیش ہوتی ہے۔ مجھے کی شام کافی ڈاس میں گزارتا ہوں۔ اتوار کی صبح منورہ جاتا ہوں کشتیوں کی سیر بھی کرتی ہے۔ واصل کراچی خاص سے منورہ جانے کے لئے کشتیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ لالچ بھی مل جاتی ہے یعنی جن والی کشتی لیکن مجھے یاد دہانی کشتی پسند ہے۔ دیر سے تو پہنچاتی ہے لیکن وہ کشتی کیا بس میں یاد بان نہیں۔ طاق نہیں۔ ٹوہنے کا خطرہ نہیں..... سو میرے بھائی یہ ہے آج کل کی زندگی اور مجھے اس زندگی سے کوئی شکوہ نہیں۔ دیرانے کا اتنا واقع ہوا ہوں۔ آبادی سے یوں بھی گھبراتا ہوں۔ میرے لئے تو یہی کراچی ہے۔ میرے خیال میں یہ سب چیزیں تمہیں دکش اور عاجز نظر لگیں گی۔ مگر ایسا ہے تو مجھے کوئی

تجربہ نہ ہوگا۔

اد پر کی سڑکیں کل دفتر میں تمہارا خط ملنے پر کھسی تھیں اور یہ چند سطر اپنی بیک سے لکھ رہا ہوں۔ موٹو میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ چنانچہ باتیں بھی اسی طرح کی کروں گا۔ سرویاں شروع ہو چکی ہیں اور رات کو کافی سو رہتی ہے۔ یہاں کونسل سے سروی کی لہر آیا کرتی ہے اور تم اخبار پڑھتے ہو تو تمہیں معلوم ہوگا۔ کہ کونسل میں آج کل درجہ ہزارت ۱۹ ڈگری تک پہنچ جاتا ہے یعنی درجہ انجماد سے بھی ۱۲ ڈگری نیچے۔ خیر ہر جے ایک برسرِ اولاد آدم بگڑد مالی پریشانیوں سے یہاں بھی چھٹکا رہا نہیں۔ ڈھائی سو میں سے ایک سو اپنے پاس رکھ کر ڈیڑھ سو گھر بچھتا ہوں اور یہاں مضامین سے اوسط بیکاس ساٹھ روپے اور کمانے پڑتے ہیں۔ تب کہیں گانا ہوتا ہے۔ پھر کوئی نہ کوئی خرچ سامنے رہتا ہے۔ چٹکوں کی سلائی۔ ٹوٹ۔ گرم کوٹ (کپڑا۔ سلائی)۔ کمبل۔ چادریائی۔ سائیکل۔ نئی جینک وغیرہ وغیرہ۔ یہاں ڈکریاں سوٹ ہوا۔ ایک سو پڑھتا رہتا ہے کچھ قیاس پائیس سے ٹوٹے ٹوٹے کانی خرچا ہو گیا۔ اور تو اور کہ ان کا خرچ کافی ہے۔ مثلاً اسی ایک مہینے میں اٹھارہ روپے۔ نتیجہ پاؤں ہر وقت چادر سے لٹکے رہتے ہیں۔

اور باقی اب تم سب کا حال سناؤ۔ انہیں کا کیا حال ہے تمہاری تحریروں تمہارے اساتذوں اور تمہارے ناٹوں کا کیا حال ہے۔ احمد علی کا کیا حال ہے۔ ملک کا کیا حال ہے۔ صفدر کا کیا حال ہے۔ انہیں کی ہائوس میں باہر سے کون کون آ رہے ہیں۔ کانفرنس ہو کہاں۔ کیا ہے۔ اس میں جو ہم چل رہی ہے اس کا تو کچھ کچھ پتہ چلتا رہتا ہے۔ اپنی ترقی پسندوں کے مصلحتی ڈاکٹر تاجر اور عبد السلام خورشید کا مستقل کام بھی پڑھتا رہتا ہوں۔ لطاف میں (غلام) عبد اللہ ملک کی طرف

سے تاثر کا دندان شکن جواب بھی پڑھا ہے۔

میں نے یہاں آگے چند متفرق مضامین لکھے ہیں اور وہ ہیں امروز کے لیے، کیونکہ آخر رشتہ وضع و تن تو برقرار رکھنا ہوا۔ ان میں بعض اتنے اچھے ہیں کہ میں امروز کی بجائے سویرا میں چھپوانے کو ترجیح دیتا ہوں۔ میرے نزدیک میرے سب سے بڑی ضرورت یہ رہا ہے۔ اور سویرا نے مجھ سے جو سلوک کیا ہے وہ کافی شرمناک ہے۔ مضمون کے لیے مجھ سے ۲۵ روپے کا وعدہ کیا گیا اور مجھ پر زور دے کر مضمون اس طرح لکھوایا گیا کہ لاہور سے کراچی آنے درمیانی آخری رات بیٹھا امروز کے دفتر میں لکھتا رہا۔ تب کہیں اسٹیج پر جب چوہدری صاحب اور لڑکی صاحبہ ملے تو مضمون ان کے حوالے کرنے کے قابل ہوا۔ اس وقت چوہدری صاحب کو یاد آیا کہ وہ روپے اپنے ساتھ نہیں لائے لیکن اس میں کوئی ہرج نہی چنانچہ انہوں نے یہاں کے ایک کتب فروش کے نام چٹ لکھ دی کہ ابن النشا صاحب میرے عزیز دوست ہیں انہیں بیس روپے میرے حساب میں سے دے دیجئے۔ میں نے ۲۵ روپے کی بجائے ۲۰ روپے پر احتجاج کیا تو انہوں نے کہا صرف اب کے لیے چاؤ۔ حالات۔ فسادات..... غیر یہاں آکر کتب فروش کے ہاں گیا۔ اس نے کہا کہ زبیر صاحب ہم سے سب کچھ وصول کر چکے ہیں۔ ان کا اب ہمارے ساتھ کوئی حساب نہیں۔ چنانچہ میں خود بھی شرمسار ہوا اور ان کو بھی شرمسار کیا۔

اس پر ایک لفظ لڑکی صاحب کو لکھا۔ جواب نہ دیا
یاد دہانی کے لئے، ایک کارڈ لکھا۔ جواب نہ دیا
شرم دانے کے لیے ایک خط لکھا۔ جواب بالکل نہ دیا

لکھ جھٹائے وفا تھا کہ نرم کو اہل حرم سے ہے
کبھی ہنسکے ہیں گردوں بیاں کو کسے صدم بھی ہی نہیں

۲۵ رکتور کا لکھا خط آج ۱۹ نومبر کو پوسٹ کر رہا ہوں۔ اس میں کچھ میرا مضمون ہے کچھ زمانے کا ہے۔ تمہارا
پیر کا

۲۵/۵

جہاں سن!

تمہارا مختصر سا طحانی سٹری خط مل گیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تمہارے امتحان اسی اور بھی باقی ہیں۔ سخت بوجھ آ رہی ہو۔ پیار سے تم رسکا کر چلی ہو۔ عبد الحمید اویب فاضل، پٹنے کی کوشش نہ کرو۔ ڈگری لے کر نہیں لے یا کسی اور نے کیا فیض پا یا جو تم پاؤ گے۔ تمہارا تمہارا قلم ہے۔ خیر اب یہ امتحان دے ہی چلو۔ سنا ہے اتفاق بند رہنے کی وجہ سے تمہیں مالی پریشانیاں بھی رہیں۔ اب یہ معاملہ شبیک ٹھاکر ہو گیا ہے۔ مارشل لانے لاہور کی یعنی لاہور کے کوپہ گرو، آوارگی پیشہ گندگی پسند، لعلی نواز، جھوٹے خور، عاشق مزاج، آزادہ دلوں کی زندگی کو جو تباہ کیا ہے اس پر کچھ لکھو۔ پیار سے وہ لاہور لاہور ہی تھا۔ لاہور صاف سڑکوں اور سستے دودھ دہی کا نام نہیں۔ پڑوسی گندی گلیوں اور اونگٹے بوئے انیسوں کا نام ہے۔ اس کے متعلق کچھ لکھو۔ انتظار کا خط آیا تھا اسے اس شہر کی تباہی کا برا اٹھ ہے۔ تم تو لاہور کو اس سے زیادہ جانتے ہو۔ تمہارا تو اس پر ناول بن سکتا ہے۔

میرا پریم محض تمہاری وجہ سے رُکا ہوا ہے۔ اب بہت وقت نہیں۔ ایک جھٹنے میں چیز بیچ دو۔ ہماری عاشقی اور اپنی عشقوت کی شرم ہی کو پیار سے ششکا۔ تمہارا
ابھی انشا

کراچی

جانی من! روح دروان من! اے حمید!
 تمہارا دوسری مچھولی کاڑھ کبھی کبھی مل جاتا ہے اور کبھی کبھی بھٹک
 لٹاؤ بھی لیکن اس سے میرا پیٹ نہیں بھرتا۔ جی تو چاہتا ہے کہ تمہیں
 دل کے شیشے میں بٹھالوں جس کے منتظر حسین دینو کو شیشے میں پری
 اتارنے کا محاورہ کہتے اور دل کے آئینے میں بے تصویر یادگار گشتیا شعر
 گنگناتے کا موقع مل سکے لیکن بس نہیں چلتا اور اس دنیا نے لافانی
 میں کسی پر کسی کا بس نہیں چلتا۔

اب سنو ایک بات مطلب کی۔ برگ گل کا پہلا پرچہ میرے
 بھائی نے تمہیں پہنچا دیا ہوگا۔ دوسرا پرچہ اچھا نکلے گا اور بازار میں
 بھی آئے گا۔ لیکن بے میری اجازت میں یہ آخری پرچہ ہو گیا۔ اس کے
 بعد میں قاریہ الفضیل جو جاؤں گا۔ لہذا میں چاہتا ہوں کہ تمہارا نام اس
 نہ کسی طرح اس سے ASSOCIATE ہو جائے۔ برگ گل کے لئے تمہارا
 کوئی مضمون مل گیا تو یوں سمجھو گا جیسے تمہیں گے دنگا گیا ہو۔ جیسے ہم
 کسی برگ کا آؤد شام میں لارنس کی طرف نکل گئے ہوں۔ جیسے ہم میرے
 چینی کا ایک میں میرے بالکل پاس بیٹھے دنیا جہاں کی حیرت انگیز باتیں
 کرتے ہوئے دنیا جہاں کے پروگرام بنا رہے ہوں۔ اور ہاں تمہاری ایسی
 تصویر بھی چاہئے جو اہر کہیں نہ چھپی ہو۔ ہمارے کالج کی لڑکیوں کو
 تم بہت پسند ہو رہے تھے اس لئے ان پر ادرہ تم پر فتنہ بھی آتا ہے، اس
 لئے اس فرمائش میں قارئین کرام کا ہر ذرہ اصرار بھی شامل سمجھ لو۔ اور یہ
 بات دیکھ لو میں یہ نہیں چاہتا کہ تم ایسا مضمون بھیجو جو ایک بار ریڈیو
 پر اور چھتیس بار روزناموں میں چھپ چکا ہو۔ اگر SERIOUS راہیو
 ٹائپ کہانی نہیں لکھ سکتے تو LIGHT قسم کی چیز بھیجو۔ دیکھو خود بھیجو

(اگر مزادے تو نے داستان غریب حمزہ مجھے نہیں بھیجی۔ سارے ریڈیو کو دیتا
 اور تمہیں لیٹرس سے زیادہ درجہ دیتا)۔ وہ نہ میرا ارادہ ہے کہ تمہارے
 بعض خطوط کو شائع کروں۔ ایک میں عینک لگی لڑکی کا منہ چومنے کا ذکر
 ہے جو ناک پر دو مال رکھ کر یوں کرتی ہے جیسے فلسفیانہ صاف کر رہی ہو
 اور باقی خطوط میں تو اس سے زیادہ حمزہ گیاں ہیں۔

پس پیارے تھوڑا لکھ کر ہمت چانو۔ ایک کہانی یا مضمون یا
 طویل خط! برائے اشاعت! ہم دو لوگ رفاقت کی یاد مجھے بھیج دو۔
 اپنی ایک یا دو تصویروں کے ساتھ۔ ایک میں اپنے پاس رکھنا چاہتا
 ہوں۔ تاکہ جب فلاں کروں جب فلاں دیکھ لوں۔ اس لئے کہ تم پر پیار بہت
 آتا ہے۔

ابن انشا

۲۳/۸

اے حمید! اپنے لطف سے تھک رہی۔

اب سنو۔ یہ جو سرکاری پرچہ ہے نہ پاکستان کو اٹرنٹی۔ آج
 کل اس کی ایڈیٹر قریۃ العین حیدر ہیں۔ میں نے ان کو فون کیا تھا کہ آپ
 اردو کی کہانیاں ترجمہ کرا کے کیوں نہیں چھاپتیں۔ انہوں نے کہا۔ تم آج
 ہی کہانی منتخب کرو اور ترجمہ کرا دو۔ اسی پرچے میں چلی جائے گی۔ میں
 نے رات کو ادب لطیف نکال کر تمہاری کہانی 'رات کا دارغ' کو اسی فخر
 سے دیکھا۔ وہ دسے کمال کی چیز ہے۔ اس میں تمہاری سبھی خوبیاں
 بھر پور ملتی ہیں۔ سرکاری پرچہ ہونے کی وجہ سے اس کے بعض حصے
 حذف کرنے کے لائق تھے۔ تھوڑا سا اختصار بھی دفتر تھا۔ لہذا وہ
 ایڈیٹنگ کیجئے کہانی پڑھی۔ اس پرچے کا انٹر نیشنل سرکولیشن ہے اور اس
 سے پہلے اس میں کچھ بھرتی اردو نکلے کہانیوں کے ترجمے چھپ چکے

ہیں اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تمہاری کہانی جو تمہارے رنگ کی تماشہ ہو ضرور آئے۔ بہر حال کہانی میں سے جس حیرت کو بھوکا دی اور انہوں نے بھی بہت پسند کی۔ اب وہ مترجم کے حوالے کر دی گئی ہے۔
تم آدمی گھٹیا ہو۔ اس لئے احتیاطاً تمہیں کھدو دیا تاکہ انسان نہ ہو کل اس کہانی کو بیکہ کر شکایت کرو کہ
کالی بنی کیوتر کھا گئی اسے

اس میں سے کوئی کیوتر نہیں کھیا گیا۔ بعض پیرے — محض ایسے پیرے حریف کئے گئے ہیں جن سے کہانی کی اچھائی میں خلل نہیں آتا۔ خصوصاً غیر کی قارئین کے نقطہ نظر سے۔
تم جیتے ہو یا مر گئے ہو کچھ معلوم نہیں۔

چرکا

سوریا - لاہور

دانی ڈیر اے حمید!

تم میری بہاڑیوں کی چوٹیوں پر ایسے چڑھ گئے ہو کہ ہم خاک نشینوں کی خبر ہی نہیں لیتے۔ بس بہت سیر ہو چکی۔ اب آجاؤ۔
قرار خاطر بے تاب تنگ گیا ہوں میں

ہاں ٹھیک ہے تمہارا خط ملا ہے۔ لیکن خط سے کیا ہوتا ہے۔
تمہیں اب تک بنفس نفس پہنچ جانا چاہئے تھا۔ مثلاً آج میری نظم ہے بغداد والی۔ جسے پڑھنے کا وعدہ تم نے کیا تھا اور انہیں ترقی پسند مصنفین یوم چین سارا ہی ہے۔ کیا یہ دن بہار کے تمہارے بغیر ہی گزر رہی گئے۔

اور پھر افسانہ۔ اب تو سوریا سچ آج آخری مراحل میں ہے چھپائی کھائی کے۔ افسانے کے لئے طوالت کے لحاظ سے جگہ بھی تو موزوں —

لیکن محبوب صاحب کہتے ہیں تمہارا خط آگیا ہے اور تم نے افسانہ پوسٹ کر دیا ہے اور تم بنفس نفس آ رہے ہو۔ بس بہتر معلوم ہوتا ہے کہ میں بھی اس سارے کیسے پر ناک ڈالوں اور کہوں۔ لو ایک قصہ سنو۔ لیکن قصہ سنانے سے پہلے مجھے یہ خط ضرور پوسٹ کرنے دو۔
ابن انشا

گمراہی
۲۲۔ نومبر

پیاز سے حمید!

تمہارا چھوٹا سا پوسٹ کارڈ ملا تھا جس میں یہ وعدہ معشوقانہ لکھی وفاق ہوں موجود تھا کہ تم مجھے جلد ہی دوسرا اور مفصل خط لکھو گے۔ وہ خط تم آج کھینچتے ہو۔

وہ ایسا اتنا نگارش میں تمہارا تحریروں والا مضمون دیکھا تھا ہے اچھا اور تمہارا منہ چوم لینے کو جی چاہتا ہے۔ اگر دو چار سال یہی حالت رہی تو ہم جیسے لوگوں کو تمہاری شہرت کے قطب بینار کی طرف پکڑی شہنشاہ کر دیکھنا پڑا کرے گا۔ چوبدری نذیر کا ذکر تو سبحان اللہ —
تم اسے اپنے گلے سے

اب بہت خوشامد ہو چکی تمہاری اب مطلب کی بات یہ ہے کہ جلد خط لکھو۔ دیر میں میرا دل کا۔

آج کل کیا حال ہے تمہارا — انعام سے کیا ملتا ہے اور پلاٹا کے ٹکٹوں کی بیک مارکٹ سے سٹریٹ کے دام نکل جاتے ہیں یا نہیں! یہ خط جو مشغوف ہے بصورت مضمون چھاپنا چاہو تو چھاپ لاؤ۔
آئندہ ایسے گھٹیا تنقیدی مضامین مت چھاپو۔

عارف کے چہن کو کچھ کھانے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟

مرزا ادیب کا ذکر ذرا DAMAGING ہو گیا ہے کہ نہیں؟
تمہارا چکر

کراچی

۴ نومبر ۱۹۷۹ء

عزیز بے تمیز - برخوردار خیانت آشکار - جیتے رہو - یہ تم نے
بڑی سعادت مند سی کی کہ ہماری علالت پر فکر مند سی کا اظہار کیا کیونکہ اس
میں کچھ نہیں گستاخے سے کچھ نہیں جانا۔ اب تمہارے کھنکھنے کے بعد
مجھے اپنی صحت کی فکر پڑ گئی ہے۔ تمہارا خط آنے سے پہلے مجھے اپنی
علالت کا احساس بلکہ پتہ بھی نہ تھا۔ صحت کاملہ کے لیے اپنی دوا بردار دست
اللہ میاں کو بھیجو۔ مجھے کوئی ڈاکٹرانہ سمجھ کر کہا ہے۔ ہاں میرے گئے ہیں
تکلیف ہے۔ وہ مجھے والوں کی دہر سے ہے۔ میں رات کو مجیر دلوں اور
میاں کی ٹوٹی کا دیا صل کرنا چاہتا ہوں۔ یہ لوگ موسیقی کا ذوق کم رکھتے
ہیں اور ان کے اعراض یا منع کرنے کے انداز بھی شائستہ نہیں ہوسکتے
اپنے شوق موسیقی کو مسلسل ضبط کرنے کی وجہ سے گائے کی گیس اسی طرح
پھول جاتی ہیں جس طرح کسی افسانہ نگار یا شاعر کی تخلیق آپ نہ نہیں
تو اسے اچھا رہا ہوتا ہے میں بعض لوگوں سے عذر بھی کرتا ہوں کہ
میں گا نہیں رہا تھا بلکہ غسلفانے میں غرار سے کر دیا تھا۔ لیکن جو لوگ
کس دس نہیں ان کو پکے گافوں کے رموز و اوقاف اور نمک کے غزاروں
کے درمیان فرق کیا معلوم؟

تو نے شراب چھوڑ دی؟ کس سے پوچھ کر چھوڑی۔ ہمیشہ
غیر ذمہ دارانہ حرکتیں کرتے ہو۔ عواقب پر نظر نہیں رکھتے۔ بے شک
شراب پینا بُری بات ہے لیکن اسی صورت میں جب کہ اپنے پلے سے
بلی جائے۔ مجھے ہمیشہ صحافی کے بھی تمہارا شراب چھوڑنا پسند نہیں

آیا۔ اب منو بھائی کو شکایتی خط لکھوں گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ
اخبار بھی بند ہو گیا ہو گا جس میں تم ٹھیکے سے بڑی شریک کر رہا کرتے
تھے۔ بہت سے صحافی بے روزگار ہو جائیں گے کیونکہ وہ لوگ تو
اخبار لکھنا لکھنا اور چھاپنے ہی تمہاری ضرورت کے لیے تھے کیونکہ
چھپ کر بیٹا مشرقی سیاک تقاضا ہے۔ جس طرح کسی کے منہ پر
سچی اور دغا زاری کی بات نہ کرنا اور فقط پتہ پیچھے اس کے بارے
میں اعلائے کلمۃ الحق ہمارے مشرقی اخلاق کا لازمہ ہے۔

قصہ اصل میں یہ ہے کہ مجھے آرام کی ضرورت ہے۔ روزانہ
مسلل کئی کئی گھنٹے کام نہ کرنے کی وجہ سے ٹھنک ہو رہی جاتی ہے۔
بعض اوقات تو مہینوں بے کاری میں مصروف رہنے کی وجہ سے سر
کھانے کی فرصت نہیں ملتی۔ اب میں باہر جانے والا ہوں کیونکہ
اس ملک کی آب و ہوا مجھے لاس نہیں آتی۔ پتہ نہیں تم ویسی لوگ
کیسے یہاں رہ لیتے ہو۔

تم بے ہدایت ہو لیکن تم کو ہدایتیں کرنا میرا فرض ہے۔
اور کوئی بدعات نہ چھوڑنا۔ دوسرے جنگ کراچی میں میرا کام بالآخر
پڑھا کر دو۔ آج بھی چھپا ہے۔ کل بھی چھپے گا اور پھر چھپتا ہی رہے
گا لیکن یہ خاص چیزیں ہیں جو میں نے فوکیو سے بھیجی تھیں۔

تاریخ ان اخباروں پر ۸ اور ۹ دسمبر کی ہوگی۔ ریحانہ اور تمہاری
اولاد کے لیے پیار۔

تم نے میری کتاب نہیں پڑھی صرف پچھنے والی نظر پڑی۔؟
ابن اثنا

اقبالیات پر نئے کتابے

حیات اقبال — ایم۔ ایسے نادر

دلورست سے دوست بنیں، مگر اہستہ طور اقبال کی زندگی کا
دورانِ دراز۔ ایک نئے فلسفے کی راہ تحقیقی بنائی ہیں۔

اقبال اور تحریک پاکستان — ایم۔ ایسے نادر

عصری آزادی کی شکل، سسٹم — اقبال اچھے شاعر و سیاست دان
کی شخصیات، سنگتیں اور اشراف کی روکش بنی ہیں۔

اقبال کے ہم عصر — ایم۔ ایسے نادر

طور اقبال کے ہاتھوں کے حوالے سے ناچ و گہرائی، اقبال کی
کائنات، ان کے متروکوں کی لڑائی۔

جوہر اقبال — میراج خان

طور اقبال کی شخصیت اور ان کی برکتی جہاز پر ہے۔ چھوٹا
مستطیل، نئی آب و تاب، دیگر لائق توجہ ہیں۔

اقبال کا فلسفہ سیاسیات — شاہزادہ یحییٰ

اسلامی سیاست کے اذریہ اصول اور آئین کا فلسفہ ہمارے فلسفہ
طور اقبال نے اپنے فلسفہ و نظریات سے ساری زندگی اور
روحانی بنی۔

اقبال کا ادبی نصر العین — ہدایت حسین

شاہد شری کے فیض میں ہر قسم کے مقامات، ان کی آواز
پیشیت سر ہے۔

مستعار اقبال — فضل علی مایہ

عام اقبال کے مشرقی نظریہ، ان کی شہری عادات اور خیالات
پر ایک منہ سے کتاب۔

زندہ روو

شاہزادہ یحییٰ کا دہائی

شاہزادہ یحییٰ کا دہائی، شاہزادہ یحییٰ کا دہائی، شاہزادہ یحییٰ کا دہائی

شیخ غلام علی ایضاً مسعود، پبلشرز

لاہور، میراج خان، کراچی

①

زندہ رُود

حیاتِ اقبالؔ کا تشکیلی دور

②

زندہ رُود

حیاتِ اقبالؔ کا واسطوی دور

③

زندہ رُود

حیاتِ اقبالؔ کا اختتامی دور

سوانحِ اقبالؔ کی ترتیب کا تینے جلدوں پر مشتمل یہ سلسلہ کتب جاویدِ اقبال کی نو برس کی تحقیق کا نتیجہ ہے۔ تینوں جلدیں علامہ اقبالؔ کی نجی اور فکری زندگی سے حقیقی معنوں میں شناسائی کے لیے ایک کلید کی حیثیت رکھتی ہیں۔ پس حیاتِ اقبالؔ کے موضوع پر اگر آپ کسی مستند تحریر کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو اس سلسلہ کتب سے استفادہ کیجیے، کیوں کہ یہ اقبالیاتی ادب میں ایک اچھوتا اضافہ ہے!

شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیٹ) لمیٹڈ پبلشرز

کراچی

● حیدرآباد ●

● لاہور ●